آسیہ مذاق

# نئی دلہن کی تلاش

"شادی کرلو۔ سارے مسائل کا حل ہے۔"

جب کئی دوستوں نے یہی بات کی تو محسن جھلا سے گئے۔ کوئی دوسری رائے کیوں نہیں دیتا۔ کوئی دل کو لگنے والی۔ امید افزا، گنجائش والی بات۔ وہ پریشان رہنے لگے۔ بیمار والدہ۔ بچے بہت ناسمجھ۔ گھر، گھر والی سے خالی۔

جب بھی آپا آتیں، جھاڑ پونچھ، صفائی ستھرائی میں لگ جاتیں ان کا پورا وقت محسن کے گھر کی درستی میں صرف ہو جاتا۔ ماں کے پاس چین سے بیٹھنے کی فرصت بھی نہیں ملتا تھا۔

ایک روز آپا کے ساتھ ان کی ساس بھی اماں کی خیریت دریافت کرنے کو آگئی تھیں۔ ہر سمت نظر دوڑا کر اطمینان سے بولیں۔

"میاں۔ تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ گھر کا گھر ویران رکھا ہے عورت ہی گھر کو جنت بنا سکتی ہے۔ اور تمہارے پاس تو کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ بس ایک بنی سجی، نک سک سے درست دلہنیا کی کسر ہے۔"

محسن جھینپ گئے۔ اس عمر میں بنی سجی دلہنیا کا تصور کب سے بھلا رکھا تھا انہوں نے۔

"بوڑھے آڑے تو ہو نہیں تم۔" آپا کی ساس نے ناک پر انگلی رکھ کر بڑے انداز سے کہا۔ "ماشاء اللہ سو جوانوں کے جوان ہو۔ لڑکیوں کی اس دیس میں کمی تو نہیں۔ اشارہ کرو۔ دس حاضر ہو جائیں گی۔"

آپا کو لڑکیوں کی بے وقعتی اچھی نہیں لگی۔ منہ بنا کر آہستہ سے بول پڑیں۔

"آپ کے لیے تو ہر چیز آسان ہو جاتی ہے۔ جب کام میں ہاتھ ڈالو تو مشکلات کا علم ہوتا ہے۔ یہ مشورہ تو ہزار دل لوگ دے چکے ہیں مگر کسی نے کوئی لڑکی حاضر نہیں کی۔"

"ارے بیٹی تو پتا تو چلے کہ مشکل کیا ہے؟"

"جیسے آپ کو علم نہیں۔" آپا نے ترچھی نظروں سے ساس کو دیکھا۔ ان کو متوجہ پا کر دبی زبان سے بولیں۔

"یہ بچے۔ محسن کی پہلی شادی۔ دوسری شادی ایک مسئلہ ہے اماں جان۔ کسی کو اپنی بیٹی اتنی دوبھر نہیں ہوتی کہ وہ۔ دو بچوں پر دے دے۔"

محسن ایک بار پھر شرمندہ ہوئے۔ آپا کی ساس محسن کی اماں کے پاس جا بیٹھیں۔ اور دبی زبان سے وہی مشورے دیتی رہیں۔ جاتے جاتے سمدھن نے اماں سے کہا۔

"بس تم بے فکر ہو جاؤ آپا۔ میں کسی نیک شریف لڑکی

سے محسن میاں کا سلسلہ جوڑ کر رہوں گی۔"

محسن نے اماں کو منع بھی کیا۔ "اماں، بیکار۔ میرا مذاق اڑوانا ہے کیا؟ میں مطمئن ہوں اس زندگی سے تو دوسروں کو اس قدر فکر کیوں ہے بھلا۔ سمدھن کو منع کر دیں۔"

مگر اماں سمدھن کی ہمدردی کے احسان تلے دب چکی تھیں۔ اس کے علاوہ گھر انتشار کا شکار تھا۔ کام کرنے والی بوا تھیں جو بچوں کی دیکھ بھال کے علاوہ اوپر کے بہت سے کام کرتی تھیں۔ خود اماں کو توجہ کی ضرورت تھی۔ ان کے پیروں میں شدید درد رہتا تھا۔ روز گھٹنوں پر مالش کرواتی تھیں۔ وہ تو اللہ کی قدرت کہ محسن کے ایک چچا کی بیٹی بیوہ ہوگئی۔ اور اسے اماں نے بلا لیا۔ ——— اس کے بیکے میں بھی اب کوئی بھاوج کے سوا کوئی نہ تھا۔ بھاوج کثیر الاولاد ہونے کی وجہ سے بیوہ نند سے خار کھانے لگیں۔ تو وہ مہربان بچی کی خدمت کرنے آموجود ہوئیں۔ گھر کا انتظام انہوں نے سنبھال لیا۔

اس کے باوجود محسن کو کسی کمی کا احساس رہتا۔ ان کی ضرورت کی چیزیں وقت پر نہیں ملتی تھیں۔ وہ جب بھی کمرے میں آتے بچے مٹی دھول میں اٹے ہوتے۔ کبھی منہ پر دستے، کبھی ناخن بڑھے ہوئے۔ انہیں اس گندگی سے کوفت ہوتی ———

——— اماں سے شکوہ کرتے تو وہ اپنی لاچاری کا اظہار کرتیں۔ بوا کا عذر ہوتا کہ بچے ان کے قابو میں نہیں۔ بڑی آپا مستقل باورچی خانے میں مصروف۔ وہ گھر کی آرائش کے لیے کتنی ہی چیزیں لے کر آتے۔ مگر وہ قرینے کی محتاج ہی رہتیں۔ کوئی چیز جگہ پر مناسب معلوم نہ ہوتی۔ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتے۔

بچوں کے ناخن تراشنا۔ روز صبح کنگھا کرنا انہوں نے خود ہی اپنے ذمے لے لیا۔ گھر آتے ہی ان کو نہلا دیتے۔ بوا سے کہتے کہ صاف لباس انہیں پہنا دیں۔ تاکہ ان کو بچوں کے سلسلے میں زیادہ کوفت نہ ہو۔ بوا اور آپا نے بھی جب محسن کو اس طرف متوجہ پایا تو خود اپنی ذمہ داری محسوس کر کے وہ بطور خاص ان کا خیال کرنے لگیں۔ خصوصاً جب محسن کے آنے کا وقت ہوتا۔

انہی دنوں آپا کی ساس نے خوشخبری سنا دی۔ کسی شریف گھرانے میں محسن کے لیے بات کی تھی۔ لڑکی والوں کو اعتراض نہیں۔ وہ کسی دن گھر آکر محسن سے ملاقات کریں گے۔ اس طرح وہ ان کا گھر۔ رہن سہن اور پوزیشن کا اندازہ بھی کر لیں گے۔

ابھی وہ لوگ آئے نہیں تھے کہ شبو صاحب سے محسن صاحب کی ملاقات ہوگئی۔ شبو صاحب محسن کے بہت پرانے بے حد عزیز دوست تھے لیکن چھ سات سال سے کہیں غائب تھے۔ اچانک ملے۔ اور گھنٹوں پرانی باتوں کا اعادہ ہوتا رہا۔ شبو صاحب کافی بدل گئے تھے۔ پہلے وہ ہر بات پر قہقہہ لگایا کرتے تھے۔ یہ اسکول کے زمانے کی بات ہے۔ جب کالج میں آئے تو تعلیم میں مصروف ہوگئے۔ ہر سال پوزیشن لیتے مگر ان کا اسٹائل قدرے مختلف ہوگیا۔ اب وہ جملہ ختم کرنے کے بعد قہقہہ لگانے لگے۔ کالج سے یونیورسٹی پہنچتے پہنچتے ان میں یہ تبدیلی ہوئی کہ وہ بات کے درمیان ہلکا سا ٹھٹھہ لگاتے۔ آدھی بات کی۔ ٹھٹھہ لگایا۔ جملہ پورا کیا اور کسی کتاب میں گم ہوگئے۔ اب کئی سالوں کے بعد اتفاقاً سرِ راہ مل گئے تو بے حد سنجیدہ۔ بلکہ مقطع چقطع۔ ہمرنگ لباس، جوتے، ٹائی، موزے رومال تک۔ آنکھوں پر نازک فریم کی قیمتی عینک۔

محسن کافی مرعوب ہوئے۔ گھر لائے اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس دوران انہوں نے بچپن کے اس یار کے مزے سے قہقہے کی آواز نہیں سنی۔ اب وہ بات بھی یوں سرگوشی کے انداز میں کرتے جیسے بہت راز کی یا خطرے کی ہو۔

محسن نے باتوں باتوں میں اپنے مسائل کہہ سنائے۔ ان سے رائے لی۔

شبو صاحب نے انگلی سے عینک اوپر سرکائی۔ صوفے کی پشت کا سہارا لیا۔ پیر اوپر کر کے میز پر رکھے اور ہونٹوں کی چونچ بنا لی۔ پھر چند لمحوں بعد پیر میز سے اتارے۔ صوفے کی پشت چھوڑ کر آگے سرکے۔ نشست میں کچھ تبدیلی کی اور محسن کی سمت جھک کر نہایت رازداری سے بولے۔

"زندگی میں صرف اور صرف ایک خانساماں ہو ——— اور یہ کی آخری بات ہے۔ یہ ہے اصل نکتہ ——— مزے سے کھاؤ۔ وقت پر چلے ناشتا۔ کپڑوں پر استری اور جھاڑ پونچھ بھی اسی کے ذمے کر کے ہر طرف سے بے نیاز ہو جاؤ۔"

"مگر میرے بچے ہیں۔ ماں ہیں۔ اور گھر کے بہت سے اور بھی تو کام ہیں۔"

"ہمیں دیکھو۔" انہوں نے سر جھکا کر محسن کے سینے میں سرگوشی سی کی۔ "بیوی ناراض ہو کر پچھلے سال میکے چلی گئی۔ پروا نہیں۔ بس خانساماں ہونا چاہیے۔ یہ ہے اصل نکتہ۔ اب ہم آزاد ہیں، خوش ہیں۔ اپنی مرضی سے گھر آئے۔ نہ بھی آئے تو کوئی ڈر نہیں۔ خانساماں ہونا چاہیے کیونکہ بیٹ بڑی بلا ہے۔"

"لیکن شبو صاحب۔ میں آزاد نہیں ہو سکتا۔ میرے ساتھ



صرف میرا پیٹ ہی نہیں۔ میرے بچے۔ ماں، بہن ہیں۔ اور صرف خانساماں ہی تو میرے مسائل کا حل نہیں۔ میرا کنبہ ہے۔ خاندان ہے۔ بچوں کی تربیت، ماں کی خدمت۔ گھر کی آرائش۔ میں ان تمام مسائل کا حل چاہتا ہوں۔ یار کچھ تو بتاؤ۔"

"آیا رکھ لو۔" انہوں نے اور آگے جھک کر محسن کے پیٹ سے سرگوشی کی۔ "ماں کے لیے نرس رکھ لو۔ مگر یاد رکھو خانساماں سب سے ضروری ہے۔ وہ آرائش بھی کر سکتا ہے۔ بچوں کو کمپنی دے سکتا ہے۔ اماں جان کی خدمت میں ہاتھ جوڑے رات بھر کھڑا رہے گا۔ بس اسے تنخواہ معقول دو۔ اس کی فیملی کو گھر دے دو پھر دیکھو تماشا۔ سارے مسائل چٹکی بجاتے حل ہوں گے۔" انہوں نے محسن کے گھٹنوں کے پاس چٹکی بجائی۔ محسن کو ہنسی آگئی۔ شبو صاحب نے سر اونچا کیا۔ اٹھلی سے عینک کو اوپر سرکایا۔ صوفے کی پشت سے کمر ٹکائی اور چپکے سے بولے۔

"ہنسو مگر سوچنا۔ بعد میں تمہیں علم ہوگا کہ میرا تجربہ زیادہ معقول ہے۔ ارے ہم بھگت رہے ہیں۔ آرام سے۔ چین کی زندگی۔ کوئی ڈر نہ خوف۔ نہ ذمے داری۔"

"سب کہتے ہیں مجھے شادی کر لینی چاہیے۔" محسن نے قدرے جھینپ کر مجرمانہ سرگوشی میں کہا۔

"ہیں؟" شبو صاحب اچھل گئے۔ "کون۔ کون کہتا ہے دشمن ہیں سب۔ دوست ہوتے تو ایسا خطرناک مشورہ نہ دیتے۔ یار محسن لگتا ہے تمہارے خلاف کوئی سازش ہو رہی ہے۔ بندھ جاؤ گے۔ پھنس جاؤ گے۔ بیوی سے جتنی دور رہو گے تمہارا فائدہ ہوگا۔ میں ایک خانساماں ہو اور زندگی مزے سے گزرتی ہے یاد رکھنا کسی دن میرے گھر آنا اور میری سکھ چین کی زندگی ——— آنکھوں سے دیکھنا۔ آنکھوں سے۔"

محسن ان کے پراعتماد لہجے سے بے حد متاثر ہوئے۔ گو کہ ان کے مشورے نے ان کو بالکل متاثر نہیں کیا تھا۔ شبو صاحب قطعاً نامعقول نہیں تھے۔ کھسکے ہوئے بھی نہیں لگتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ یونیورسٹی کی زندگی سے باہر آنے کے بعد وہ کافی عرصہ غائب رہے۔ پھر ملے تو اسی پرانے خلوص کے ساتھ مگر محسن کو ان کی نئی زندگی کے بارے میں کچھ علم نہ ہو سکا۔ محسن کی شادی ہو چکی تھی۔ انہوں نے شکوہ بھی کیا تھا کہ اگر محسن یاد رکھتے تو اپنے پرانے دوست کا سراغ لگانا اتنا مشکل بھی نہ تھا۔ اب پھر چھ سال کے بعد وہ ملے تو ان کی گفتگو کا انداز ہی بدلا ہوا تھا۔ مگر پہلے کے مقابلے میں وہ سنجیدہ، معقول اور مدبر سے لگے۔ اب کبھی کبھی ان کی محسن سے

ملاقات ہوئی تو وہ گردن آگے بڑھا کر محسن کے کندھے سے سر ملا دیتے اور سرگوشی میں پوچھتے۔ "خانساماں ملا کوئی؟"

---

آپا کی ساس آگئی تھیں۔ محسن سے رشتے کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھیں۔ محسن کے منہ سے نکل گیا۔ "شادی کی اتنی ضرورت نہیں جتنی ایک خانساماں کی ہے۔"

آپا کی ساس خفا ہوگئیں۔ ان کی ساری محنت اور جدوجہد پر پانی پھر گیا۔ محسن کو ترچھی نظر سے دیکھتے ہوئے انہوں نے زہریلا تیر پھینکا۔

"خانساماں کیوں؟ خانساماں رکھ لو۔ وہ تمہاری تمام ضرورتیں پوری کردے گی۔"

کہہ کر لیکی ہوئی باہر چلی گئیں۔ اماں بے چاری گھٹنوں کے درد سے بے حال کراہتی ہوئی ان کے پیچھے دوڑیں۔ محسن ان کے زہر سے بجھے تیر سے شدید زخمی ہو چکے تھے۔ شرمندگی، ندامت اور ملال کی کیفیت سے نکلنا فوری ممکن نہ ہوا۔ اماں سمدھن کو منا کر لے آئی تھیں اور لڑکی کے بارے میں سوال کر رہی تھیں۔

"دیکھو آپا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ کسی نوجوان لڑکی سے یہ امید کرنا کہ وہ دوسری عورت کے بچوں کو ماں بن کر پالے گی یا نہیں ماں کی محبت دے گی۔ ان کو ــــ اس محرومی کا احساس تک نہ ہونے دے گی۔ غلط بلکہ ناممکن ہے۔ ہاں وہ گھر والی بن کر میاں محسن کی محرومیوں کا ازالہ کر سکتی ہے۔ گھر کو صاف ستھرا رکھے گی۔ بلکہ بچوں کی دیکھ بھال بھی کرے گی۔ کوئی گھر میں مہمان آیا تو اس کی تواضع کی ذمے داری اسی پر ہوگی۔ مگر اسے قطعی طور پر بچوں کی ماں بننا نہیں آسکتا۔ ہاں رفتہ رفتہ ــــ وہ اس فرض کو بھی پورا کرے گی۔ اگر سب کا تعاون ملا تو۔"

آپا کی ساس چائے پی کر کیک کھا کر اور اماں کے باندان سے اپنی مرضی کا بڑا سا پان بنا کر کھانے کے بعد مطمئن سی ہو گئی تھیں محسن پچھتائے پچھتائے اماں کے پیچھے کرسی پر سر جھکائے بیٹھے رہے۔ سمدھن کے جانے کے بعد اماں نے بڑی آپا سے مشورہ کیا۔ وہ بے چاری کیا بولتیں۔ محسن کی سمت دیکھنے لگیں۔ محسن نے آہستہ سے کہا۔

"اماں۔ انہوں نے تو شادی سے پہلے ہی تنبیہ کر دی ہے شاید لڑکی تیز مزاج کی ہے۔ اگر وہ ماں بننے پر تیار نہیں ــــ تو مجھے اس میں کوئی کشش نظر نہیں آتی ــــ یوں بھی ــــ سب ٹھیک ہے۔ اور اگر خانساماں ہو تو پھر ــــ"

اماں نے تیز نظر سے انہیں دیکھا۔ "صرف بچوں کے لیے ہی تو تمہاری شادی کا سوال نہیں اٹھا ہے۔ خود تمہیں بھی ایک بیوی، گھر والی کی ضرورت ہے بیٹا۔ میرا حال دیکھ رہے ہو۔ خدیجہ کا اللہ بھلا کرے۔ میری تو سب ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں۔ بچے اسکول جاتے ہیں۔ ٹھیک ٹھاک پڑھ رہے ہیں۔ خدیجہ اور بوا ان کی دیکھ بھال کر ہی لیتی ہیں۔ مگر مجھے تمہاری بہت فکر ہے۔ تم خود کسی سے کچھ کہتے نہیں کہ کیا چاہیے۔ کیا چاہتے ہو۔ کبھی تمہاری ضروری چیزیں غائب ہو جاتی ہیں۔ کبھی تمہارا لباس مناسب نہیں ہوتا بغیر استری کے ہی پہن لیتے ہو خدیجہ تمہارے کمرے کی صفائی خود کر دیتی ہیں مگر ان کو بھی علم نہیں کہ تم کو کس طرح کی سیٹنگ پسند ہے۔ یا کہاں پہ آرائش کی جائے۔ تم خود ہی سامان ادھر سے ادھر ــــ کرتے ہو۔ بیوی ہوگی تو کم از کم تمہاری پسند کا لحاظ تو کرے گی۔ گھر کی آرائش کرے گی۔ عورت کے بغیر مرد کی زندگی ادھوری ہے۔ اسی طرح مرد کے بغیر عورت بھی ادھوری اور اکیلی ہوتی ہے مگر عورت کی تو صبر و برداشت کی وجہ سے عمر گزر جاتی ہے۔ مرد کو عورت کی کمی بڑھاپے میں بھی محسوس ہوتی ہے۔"

"مجھے محسوس نہیں ہوتی۔" محسن چڑ گئے۔ "اب تک اچھی خاصی گزر گئی۔ باقی بھی گزار لیں گے۔"

"وقت کا کچھ پتا نہیں کب بدل جائے۔ حالات بھی بدل جاتے ہیں وقت کے ساتھ یہ نہ ہو کہ پچھتاوے کے ساتھ زندگی گزارنا پڑے اور یہ زندگی بہت اذیت ناک ہوتی ہے۔"

اماں کی دلیلیں معقول سہی۔ پھر بھی محسن کو یقین تھا کہ خانساماں کی بھی کچھ نہ کچھ اہمیت ہوتی ہے۔ انہوں نے ایک خانساماں کا انتظام کر ہی لیا۔ جب اس نے آکر باورچی خانہ سنبھالا۔ بڑی آپا کو اپنی برتری محسوس ہوئی۔ وہ بار بار گھر آنے لگیں۔ محسن کو پہلے کھانا مل ہی جاتا تھا اور یقیناً بہتر ہی ہوتا کیونکہ بڑی آپا بہت اہتمام سے کھانا پکاتی تھیں۔ اب بڑی آپا کو آرام کا موقع تو ملا مگر محسن کو ہر سمت سے شکایتیں ملنے لگیں۔

اماں کو خانساماں سے شکایت تھی کہ وہ گھی زیادہ خرچ کرتا ہے۔ گوشت سبزی سے پیسے بچاتا ہے۔ دوگنا خرچ ہو گیا ہے۔ بڑی آپا کا کہنا تھا کہ وہ جتنی صفائی کچن میں رکھتی تھیں یہ خانساماں آٹے کی گندگی پھیلاتا ہے۔ سر کھجا کر ہاتھ نہیں دھوتا۔ سبزی کیا وہ کر کھجا کر بھی ہاتھ دھونا نہیں جانتا۔ کھانے میں اکثر بال ہوتے ہیں۔ دال میں کنگھی سبزی میں کیڑے وہ صاف کیے



بغیر ہی پکا لیتا ہے۔ ان کے اتنی محنت سے سجائے ہوئے جمے جمائے مسالوں کے ڈبوں کو اس نے گندے ہاتھوں سے پکڑ کر میلا کر دیا اور اب ترتیب ہی نہیں رہی۔

بوا کو شکوہ تھا کہ خانساماں ان کی عزت نہیں کرتا۔ انہیں آخر میں بچا کھچا کھانا دیتا ہے۔ خود انہیں کھانا نکالنے نہیں دیتا کیونکہ اس کا کہنا ہے۔

"بوا۔ کچن میں تمہارا کوئی کام نہیں۔ یہ جگہ میرے انڈر میں ہے۔"

صومی اور نعمان نے خود خانساماں کو دیگچی سے بوٹی نکال کر کھاتے دیکھا تھا۔ دودھ کی بالائی بھی وہ بڑی صفائی سے انگلی سے نکال کر کھا جاتا تھا۔ محسن سن سن کر عاجز آ گئے۔ خانساماں نے کچن کے سوا دوسری طرف نظر اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔ محسن اسے جھاڑو پونچھ اور صفائی کے لیے کہتے تو وہ کہہ دیتا "صاحب یہ ہمارا کام نہیں۔" کچن سے فارغ ہو کر وہ سرونٹ کوارٹر میں جا کر بند ہو جاتا۔ اب چائے کے وقت سے پہلے اسے کمرے سے برآمد کرنا۔ کس کی مجال تھی۔ نتیجہ یہ کہ مہینہ پورا ہونے سے پہلے انہیں جواب دے دیا گیا۔ بوا اور بڑی آپا مسرور ہو گئیں۔ اماں بھی مطمئن تھیں۔ محسن کا تجربہ ناکام ہو گیا تو انہوں نے شادی کے لیے اقرار کر لیا۔ سمدھن نے فوراً لڑکی کے والدین کی محسن سے ملاقات کرا دی۔

[illegible] چٹ پٹ شادی ہو گئی [illegible] سسرال والے شریف تو تھے۔ خاندان بھی اچھا تھا محسن مطمئن ہو گئے۔ اماں کی ساس نے بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور۔ ایک سہ پہر کو شام [illegible] دلہن کو گھر لے آئے گھر میں بوا اور اماں تو موجود تھیں۔ بڑی آپا بھی آئی ہوئی تھیں۔ فکرمند جانے بہو کیسی ہو۔ مزاج کڑوا نہ ہو۔ بچے ان اور سسر [illegible] کی کوشش تھی کہ دولہن کے گھونگھٹ میں سر گھسائے بیٹھی رہے۔ نعمان نے بس ایک بار پوچھا تھا۔

"ایا۔ یہ کس کی دلہن ہے؟" والدی کے بتانے پر کہ یہ تمہاری امی ہے وہ بہت مایوس اور حیران نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنی امی کو ہاسپٹل جاتے دیکھا تھا۔ پھر نہ وہ آئیں نہ کسی نے انہیں بلانے کی کوشش کی گھر میں کبھی ذکر نہیں ہوا۔ وہ پوچھتا تھا تو ابا اسے تسلی دیتے تھے۔

"لائیں گے بیٹا لائیں گے کیوں نہیں مگر شرط یہ ہے کہ تم اچھے بچے بن جاؤ۔ پھر دیکھنا۔ امی خود ہی آجائیں گی۔"

وہ اچھا بچہ بننے کے تمام جتن کر چکا تھا۔ اب ــ اب امی آئیں بھی تو کس قدر اجنبیت تھی۔

ان کی شکل بھی بالکل بدلی ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر اسے نہیں دیکھا۔ امی ایسی تو نہیں ہوتیں۔ اسے تو امی کی وہ گرمی آغوش یاد تھی۔ ان کے بازوؤں کا حصار آج تک اس کے گرد قائم تھا۔ ان کے بوسے ابھی تک اس کے چہرے پر گلابی بکھیر دیتے تھے وہ روز سوتے وقت امی کی محبت، ان کی قربت اور لمس کو یاد کرتا۔ اور خود بخود اسے وہ سب کچھ مل جاتا۔ ماں کی خوشبو اس کے قریب مہکتی۔ ان کے بازو اسے آغوش میں لے لیتے۔ گرمی، محبت، تحفظ اور سکون اس کے آس پاس موجود رہتا اور وہ آسودگی کے دامن میں آنکھ بند کر کے سو جاتا۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا تھا کہ جب وہ اچھا۔ بہت ہی اچھا بچہ بن جائے گا تو امی دن کے اجالے میں سب کے سامنے آکر اس کو گود میں اٹھا لیں گی۔ اس کے گالوں پہ ان کے میکتے ہوئے گرم بوسے ہوں گے اور خوشی اس کے ہر طرف ناچ رہی ہوگی۔ مگر جانے کب وہ دن آئے گا۔ وہ اداس ہو جاتا۔

لیکن آج جو عورت دلہن بن کر آئی تھی اسے امی ماننے کو اس کا دل نہ چاہتا تھا۔ نہیں۔ ایسی امی نہیں ہوتیں۔ ان کے پاس امی کی وہ خوشبو نہیں وہ گرمی نہیں۔ ان کی تو شکل بھی امی جیسی نہیں وہ دل میں فیصلہ کر کے ان کے پاس سے دور ہو گیا۔ دوسرے کمرے میں جا کر بڑی پھپھو کے پاس لیٹ گیا۔

بڑی پھپھو کے پاس سے گرم مسالے کی خوشبو آتی تھی مگر وہ کہانیاں بہت مزے مزے کی سناتی تھیں اور اب تو وہ گرم مسالے کی خوشبو کو پسند بھی کرنے لگا تھا۔ اس لیے بڑی پھپھو سے لپٹ کر سونے میں بھی مزا آتا تھا۔ ایسے میں وہ امی کی قربت سے بے نیاز ہو جاتا۔ محسن نے کھانا تو باہر کے کمرے میں چند مہمانوں کے ہمراہ کھا لیا تھا۔ سب کے رخصت ہونے کے بعد کچھ دیر وہ ٹہلتے رہے تھے۔ پھر دروازے کھڑکیاں بند کر کے باہر نکلے۔ بوا کمرے کے باہر آ رہی تھیں۔ وہ رک گئے۔ بوا نے سر پہ آنچل رکھ کر کہا۔

"میاں۔ رات کافی گزر گئی ہے۔ اب آپ بھی آرام کیجیے صومی بی بی اور نعمان میاں اپنی پھپھو کے پاس سو گئے ہیں۔ ان کی حکومت کریں۔ میں نیلم کے پاس سو رہوں گی۔"

کہہ کر وہ چلی گئیں۔ محسن نے ایک لمبا سانس کھینچا۔ اور قدم گھسیٹتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب چلے۔ ان کے کمرے کے برابر بچوں کا کمرہ تھا۔ جو بند تھا۔ بوا بچوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ پتا نہیں آج نعمان اپنے کمرے میں کیوں نہیں سویا۔ صومی کو کسی نے دودھ بھی دیا تھا یا نہیں بچوں کے رات کے لباس بھی انہیں پہنائے گئے کہ نہیں۔ بڑی آپا اس معاملے میں لاپروا تھیں۔ نہ تو خود ہی رات کو لباس تبدیل

کرتی تھیں نہ بچوں کو تبدیل کراتی تھیں وہ جھلاتے تھے مگر کہہ نہیں پاتے تھے۔

انہیں بڑی آپا کی بے چارگی، بیوگی اور بے رنگ و بو زندگی پر بہت ترس آتا تھا۔ وہ خود تاکید کر کے بچوں کے لباس تبدیل کراتے تھے۔ کیونکہ سارے کام ہی بڑی آپا اور بوا کرتی تھیں۔ وہ سوچے ہوئے کمرے کے اندر آ گئے۔ کمرے میں کسی قسم کی آرائش نہیں کی گئی تھی۔ پہلے جیسا ہی کمرہ تھا مگر آپا نے پھولوں کا اہتمام کر رہی دیا تھا۔ گلدانوں میں گلاب اور دیوار پر موتیا کے ہار لٹک رہے تھے دلہن ان کی منتظر ہی تھی۔ انہیں افسوس ہوا۔ آدھی رات تک ان کی وجہ سے وہ جاگتی اور تکلیف اٹھاتی رہی۔ بے چاری لڑکی۔ انہوں نے فوراً ہی افسوس کا اظہار بھی کر دیا۔ وہ چپ رہی مگر اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات معدوم نہ ہوئے۔ محسن کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب وہ کیا بات کریں۔ یہ موقع زندگی میں دوسری بار آیا تھا۔ پہلی بار وہ بے حد پُرجوش اور مسرور تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ زندگی کو نیا مفہوم مل گیا ہے۔ مگر آج وہ خوش تھے نہ پرجوش۔ نہ ہی سنجیدہ، وقت نے انہیں سنجیدگی کا سبق دیا تھا۔ وہ آج محض سنجیدہ تھے۔ کسی ولولے یا جوش کے بغیر انہوں نے دلہن کو مخاطب کیا۔

"اس گھر میں آپ کو سارے حقوق ملیں گے اور تمام تر اختیار بھی آپ کے پاس ہوگا۔ میں تو صرف آپ سے تعاون کی درخواست کر سکتا ہوں۔ حکم نہیں دوں گا۔ یہ شادی۔"

دور کے۔ دلہن کا چہرہ گھونگھٹ میں تھا لیکن وہ اس کا نچلا حصہ بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ نکیلی ٹھوڑی اور بھرے بھرے ہونٹ۔ لیکن ان ہونٹوں پر نہ تبسم کی لکیر تھی۔ نہ شوق کی تھرتھراہٹ وہ ساکت و جامد تھے۔ ان کا حوصلہ پست ہونے لگا۔ پھر ہمت کر کے بات پوری کی۔

"یہ شادی دراصل میں نے صرف اپنے شوق کے لیے نہیں کی۔ دراصل میں اپنی بیمار ماں۔ بیوہ بہن اور چھوٹے بچوں کے بغیر ادھورا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں مرد عورت کے بغیر ادھورا ہوتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی کی تکمیل کے لیے آپ کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اس امید کے ساتھ کہ آپ کو یہ گھر اور اس گھر کے رہنے والے اپنی خوشیوں میں شریک کر کے مطمئن ہوں گے۔ آپ کو یہ خوشی اور اس چھوٹے سے کنبے کی حکومت مبارک ہو۔"

دلہن اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں۔ شاید وہ ان کی پیش قدمی کی منتظر تھی۔ مگر اس کے ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ انہوں نے خود ہی اس کے چہرے کو گھونگھٹ کی قید سے آزاد کیا بلاشبہ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔

"شاید آپ کو میری باتیں پسند نہیں آئیں۔" انہوں نے قدرے بے تکلفی سے کہا۔ "دراصل میں ایک عملی انسان ہوں۔ ابھی تک باتیں نہیں کر سکتا۔ سیدھا سادا آدمی ہوں۔ کسی کو دکھ نہیں دیتا اور دوسروں سے بھی یہی توقع کرتا ہوں کہ وہ مجھے پریشان نہ کریں۔ میری چھوٹی سی دنیا ہے۔ اماں، بچے، بڑی آپا۔ اس پرسکون جھیل میں کوئی پتھر آ کر گرتا ہے تو میں پریشان ہو جاتا ہوں میں پتھروں سے خوف زدہ ہوں کہ وہ کوئی زخم نہ دے دیں۔"

وہ کہنا کچھ اور چاہتے تھے۔ لیکن احساسات الفاظ کا ساتھ نہ دے سکے۔ دلہن نے معمولی سی حرکت کی۔ اس کے ہونٹ وا ہوئے پلکیں اٹھیں، گریں۔ پھر آواز نکلی۔

"چھوٹی سی دنیا کو وسیع کرنے کا خیال کیوں آیا؟ اس طرح تو پتھروں کی یلغار بہت تکلیف دہ بھی ہو سکتی ہے۔" وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بول رہی تھی۔

محسن حیران رہ گئے۔ "میں سمجھا نہیں۔"

"اتنے معصوم تو نظر نہیں آتے۔" دلہن کے لہجے میں واضح طنز اور تلخی تھی۔ "ظاہر ہے کہ ایک پتھر ہی کافی ہے جو آپ کی پرسکون جھیل کو پریشانی میں مبتلا کر سکتا ہے۔"

"میں آپ سے تعاون کی درخواست کر چکا ہوں۔" انہوں نے سادگی سے کہا۔ "یہ گھر آپ کا ہے۔ اس پر آپ کی حکومت ہوگی آپ مجھ پر بھی حکومت کر سکتی ہیں۔"

"مجھے حکومت کا اتنا شوق نہیں ہے۔" دلہن نے ایکسپلر پھر تلخ لہجے میں کہا۔

"پلیز۔ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔" وہ بجھ سے گئے۔ نئی دلہن کے کلام نے انہیں حیران نہیں کیا تھا کہ یہ روشنی کا آزادی کا زمانہ ہے۔ لیکن طرز تکلم نے انہیں پریشان کر دیا۔

"آپ کو۔ کیا اس شادی پر مجبور کیا گیا تھا۔ جبراً"

"ظاہر ہے۔" دلہن نے چڑ کر کہا۔ "مجھے نہ حکومت کی خواہش تھی نہ بچوں کی۔ دراصل بچے مجھے پسند نہیں۔ اور پہلی بات جو میں نے سنی۔ وہ بچوں سے متعلق تھی۔ میں ماں کہلانا پسند نہیں کرتی۔ بس۔"

محسن نے گہرا سانس لیا۔ حلق کی کڑواہٹ کو کسی طور نیچے اتارا اور آہستہ سے کہا۔

"آپ سے بس میں اتنا چاہوں گا کہ بچے۔ کسی دکھ یا محرومی کا شکار نہ ہوں۔ آپ رنجیدہ نہ انہیں مانوس ——"

"میں وعدہ نہیں کرتی۔" دلہن نے کہا۔ "جو چیز مجھے پسند نہیں میں اس سے تعلق نہیں رکھ سکتی۔ میں آپ کو کسی خوش فہمی میں



مبتلا کرنا نہیں چاہتی۔ دراصل —— مجھے اس شادی —— کی کوئی خوشی نہیں۔ میں شاید آپ کی توقعات پر پوری نہیں اتر سکتی۔"

دلہن دوٹوک انداز میں بول رہی تھی۔ وہ پُراعتماد اور مضبوط ارادے والی تھی۔ محسن کو یک لخت تنہائی نے گھیر لیا۔

"میں آپ پر کوئی جبر نہیں کروں گا۔" کئی منٹ کی اذیت ناک خاموشی کے بعد آخر محسن نے کہا۔

"آپ اپنی خوشی سے جو کرنا چاہیں جس طرح رہنا چاہیں مجھے اعتراض نہیں اور اگر —— یہاں کا قیام۔ میرا وجود ناقابلِ برداشت محسوس ہو تو بتا دیجیے گا۔ میں آپ کی مرضی کے مطابق راستہ تلاش کروں گا۔ اگر آپ جانا چاہیں ——"

دلہن کا رنگ اڑ گیا۔ وہ گھبرا گئی۔ "نہیں۔ نہیں۔ یہ مطلب نہیں میں اپنے والدین کو دکھ دینا نہیں چاہتی۔ دراصل —— دراصل —— میں آپ کو بتانا چاہتی تھی۔ کہ مجھ سے کوئی توقعات وابستہ نہ کریں۔"

"آپ کہیں اور شادی چاہتی تھیں تو انکار کر سکتی تھیں۔" محسن کچھ اور ہی سوچنے لگے۔

"نہیں۔ میں ——— کو چاہتی تھی۔ نہ ہی اس شادی سے انکار کر سکتی تھی۔ یہ میرے والدین کا فیصلہ تھا۔ جو مجھے ہر حال میں منظور کرنا تھا۔ کیونکہ بچپن سے آج تک وہی میرے فیصلے کرتے رہے ہیں۔"

---

میں نے کمرے سے نکل کر روتی ہوئی صومی کو جھنجھوڑا۔ روئے جا رہی تھی۔ جانتی ہے یہ میرے آرام کا وقت ہے۔ جان بوجھ کر شور مچاتی ہے کہ میں سو نہ سکوں۔ روز ہی ہوتا ہے۔

جونہی میں کمرہ بند کر کے لیٹی۔ ان بچوں نے اودھم مچایا۔ اسکول کی چھٹی بھی اسی وقت ہوتی ہے۔ آج میں اسے مزا چکھاؤں گی۔ میں نے سوچا اور واقعی اودھم گئی اور اس کی آواز یک لخت بند ہو گئی۔ وہ رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اسی وقت ساتھ کے کمرے سے میرے شوہر صاحب نے باہر قدم رکھا اور حیرانی سے دیکھ کر بولے۔

"کیا ہوا ——؟ یہ صومی کو کس لیے پکڑا ہے؟"

میں نے جھٹکے سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور جھلا کر بولی۔

"مہربانی کر کے اسے چپ کرائیں۔ کچھ تمیز سکھائیں۔ ورنہ میں خود ہی سمجھ لوں گی۔ پھر سب کہیں گے کہ سوتیلی ماں ہے۔ لوگوں کو ماں کا ظلم نظر آتا ہے۔ بچوں کی حرکتیں نظر نہیں آتیں۔ میری زندگی تلخ کر دی ہے۔"

کہہ کر میں اندر کمرے میں آ گئی۔ بے اختیار دل بھر آیا آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ بستر پر لیٹ کر چپکے چپکے رونے لگی۔ یہ پہلی بار تو نہیں ہوا تھا۔ اب تو اکثر میں ان بچوں کی وجہ سے رونے آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ ان بچوں کے شور و غل، ہنگاموں سے مجھے کہیں پناہ نہ ملتی۔ میں پڑھ رہی ہوتی۔ یا سو رہی ہوتی۔ کوئی انہیں شور کرنے سے منع نہ کرتا۔ میاں صاحب تھے وہ دفتر سے آ کر اپنا زیادہ وقت بچوں میں، مہمانوں کی توقع میں یا اپنی ماں کے ساتھ گزارتے۔ ان کا کمرہ میرے کمرے کے برابر ہی تھا مگر وہ اس کمرے کو رات کے سونے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ان کے بچے بھی انہی کے پاس سوتے۔ میں اپنے کمرے میں تنہائی کو محبوب جان کر کروٹیں بدلتے صبح کرتی۔ گھر میں اللہ کا دیا سبھی کچھ تھا۔ قیمتی قالین، بہترین فرنیچر۔ آرائش کی بے شمار چیزیں مگر سب بے ترتیب اور گرد آلود۔ یہ گھر۔ میرا گھر —— مجھے بہت پسند آیا۔ مگر گھر والے کو پسند کرنے کی کوئی وجہ تھی نہ کشش ——

میں نے شادی کے دو ہفتے بعد ہی گھر کا حلیہ بدل ڈالا۔ ہر روز صفائی، جھاڑ پونچھ سے گھر اُجلا اُجلا اور فرنیچر نیا نیا لگنے لگا۔ آرائش کی چیزیں مناسب جگہوں پر سجا دیں۔ گلدان میں روز تازہ پھول لگاتی۔ خوبصورت کملوں کو نئی ترتیب دی۔ اماں جان کے کمرے سے فضول اور بے کار اشیاء باہر پھنکوا دیں۔ غرضیکہ گھر کافی بہتر لگنے لگا۔ اس کی داد تو میاں نے بھی دی۔ تعریف کی اور ہمت بندھائی۔ خوشی تو ہوئی مگر اگلے ہی جملے نے مجھے بیزار کر دیا۔

"اسی طرح اگر ان بچوں کو بھی توجہ دو گی ——

—— تو یہ بھی یونہی نکھر کر اُجلے ہو کر دل کش نظر آئیں گے۔ بانو۔ ان کا اپنا سمجھو۔ اس گھر کی طرح یہ بھی تمہارے ہیں۔"

ان کے لہجے میں لجاجت تھی۔ میں ان کو جواب نہ دے سکی۔ مگر میرے پہلی بیزاری نے ان کو مایوس کر دیا۔ بچوں سے مجھے دلچسپی نہ تھی مگر کسی طرح ان کو یقین نہ آتا تھا کہ کوئی عورت اتنی سنگدل یا کٹر ہو سکتی ہے۔ میں بھی کیا کرتی۔ شروع ہی سے دل میں بیزاری تھی۔ اس پر بچوں کو ڈانٹ دیتی یا ہلکا سا طمانچہ مار دیتی تو صومی تو حلق پھاڑ کر رونا شروع کر دیتی۔ سارا گھر میرے پیچھے پڑ جاتا سب سے پہلے بوا کسی کونے سے چلاتیں۔

"ارے چھوٹی بی بی رو رہی ہیں۔ دیکھو تو کہیں گر گرا گئیں۔ چوٹ تو نہیں آئی۔"

یہ پورے گھر کو متوجہ کرنے کا سائرن تھا۔ حالانکہ وہ بھی جانتی تھیں کہ بچوں کو دیکھنے سنبھالنے کی ذمہ داری انہیں کی تھی۔ دوسرا نوکر کوئی تھا نہیں۔ جو تھے وہ جز وقتی۔ بڑی آپا کچن سے لپکتی آتیں۔

"کیا ہوا؟ مر گئی؟ مارا؟ کس نے مارا؟ کیوں مارا؟ کیوں؟ کیا ہوا تھا؟ دیکھو دلہن۔ معصوم بچے کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ ان بچوں کو کسی نے پھول کی چھڑی بھی نہیں چھوائی مار کیا جائیں۔ پیار سے سمجھا دو تو تمہارا کوئی نقصان نہ ہو۔" وغیرہ۔

میرے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی۔ جب یہ آفت بھرے میلے کھیل رہے ہوتے ہیں۔ چیخم دھاڑ کرتے ہیں۔ کشتم پچھاڑ کرتے ہیں تو کوئی دیکھتا نہیں۔ میرے زبان ہلانے یا ہاتھ اٹھانے کی دیر ہے کہ سارا گھر ہائیں ہائیں کرتا آموجود ہوتا ہے۔ اماں جان تک تھپنے پکڑے آجاتی ہیں۔ میں کھسیانی ہو کر رونے لگتی۔

میرے میاں نے اس معاملے میں کبھی جواب طلبی تو نہیں کی مگر وہ کسی نہ کسی وقت ایک جملہ نصیحت یا التجا کا گفتگو میں بڑھا دیتے۔ وہ جانتے تھے کہ انہوں نے مجھ سے شادی کر کے مجھ پر ظلم کیا ہے۔ وہ میری پسند نہیں ہیں۔ وہ میری عمر کے مرد ہیں۔ شاید ان کی نرم طبیعت مہربان رویے کی وجہ سے ان کو پسند بھی کر لیتی مگر یہ دو عدد بچے۔ اُف ان کا گوارا کرنا میرے بس میں نہیں۔ ان کی حرکتیں، شرارتیں، ان کی ہنسی، کھیل، صورت کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ پھر میں محبت کیسے کروں۔ نفرت کی بنیاد بھی شادی کے دن مہمان خواتین کی سرگوشیوں سے ہوئی۔

"اے ہے۔ بچی عمر کا ہے۔"

"اے بی بی بال بھی کھچڑی ہیں۔ کیا سوجھی میاں اسلم کو۔ لے کے لڑکی کو ڈبو دیا۔"

"اے بہن! ہزاروں روپے کی آمدن۔ اتنا شاندار گھر اوپر سے زمین مربع الگ۔ موٹر کار۔ نوکر چاکر۔"

"اور دو عدد پلے پلائے بچے۔" کسی نے ہنس کر طنز کیا

"اوئی۔ بچے۔؟ ہائیں؟" کوئی عورت ذرا دور سے بولی۔ میرا دل دھک سے ہو گیا۔ بچے۔

"ہاں بہن۔ پہلی بیوی مر گئی۔ بچوں کی پرورش اور بیمار ماں کی خدمت کے واسطے شادی کی ہے۔"

"لو۔ دنیا میں آیا میں مر گئی ہیں کیا۔ ہم نے تو نہیں سنا کہ بچوں کو پالنے کے لیے شادی کی جائے۔"

"سنو ذرا آپا کی بات۔ بچے پالنے کے لیے دوسری شادی کرتے ہیں مرد۔ یہ کوئی نئی بات تو نہیں۔"

"بھئی۔ مگر لڑکی پرائے بچوں کو کیسے پالے گی۔ دیکھ لینا جوتیوں میں دال بٹے گی۔"

"ارے آپا۔ گھر میں دولت ہے۔ نوکر ہیں۔ کیا لڑکی اپنے ہاتھ سے کچھ کرنا ہے؟ اسے تو بس نگرانی کرنی ہو گی۔"

"ارے۔ دولت کی وجہ سے ہی میاں اسلم نے ٹھکرا دی۔ سسرال میں ہی عیش کرے بے چاری۔"

"نہیں بوا۔ پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ بچوں کی وجہ سے خاک عیش کر سکے گی۔ ہر وقت اسے دنیا کی نظروں کی نگرانی ہو گی۔ کوئی کچھ کہہ نہ دے۔ لوگ ایسے گھر میں ٹوہ کے لیے جاتے بڑھا چڑھا کر باتیں بناتے ہیں۔ اسے سوتیلی ماں کی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے۔ اور دولہا بھی تو بالکل بوڑھا ہے۔ آدھے بال سفید ہیں۔"

"بالوں کی نہ کہو خالہ جان۔ میری بھابی سلمیٰ کو دیکھا ہے نا۔ بیس برس کی ہے اور آدھے بال سفید۔ بوا نزلہ ہی ایسا ایجاد ہوا ہے کہ۔ اور مرد تو ویسے بھی دھوپ میں پھر پھر کر۔ بال سفید کر لیتے ہیں۔"

"بس رہنے دو۔ منہ پر جھریاں بھی کیا نہ لے دے کر۔ یہی بات ہے۔ دو بچوں والے دولہا کو دینے سے کوار گھر بیٹھی رہیں۔ یہی عورت کے کچے جوانی کے دشمن۔ لاکر ان سے دل لگاؤ۔ خدمت کرو۔ ایسے رہیں گے۔ ایمان سے نے خود دیکھا ہے۔ وہ جو ہیں نا۔"

جانے کس عورت کا تذکرہ چھڑ گیا تھا۔ میں دم بخود بیٹھی تھی دولہا کے بوڑھا ہونے کا سن کر تو دل میں آگ سی لگ گئی۔ اگر بال سفید ہونے کو کوئی مضائقہ نہ تھا مگر چہرے کی جھریاں سن کر تو دل پارے چلنے لگے۔ نکاح ہو چکا تھا۔ تڑپ کر رہ گئی کاش پہلے کسی نے بتایا ہوتا۔ لیکن کیا ہوتا۔ ابا کی مرضی کے خلاف تو میں بول بھی نہیں سکتی تھی۔ ہاں جب رشتے کا سلسلہ چلا ہے تو معلوم ہو گا۔ میں اس کے اقرار نہ کرتی۔ میرے تصور میں کالج کا شوخ و شنگ نوجوان سکرا رہا تھا۔ ایسا لگا جیسے جسم میں آگ لگ گئی۔ تھوڑی دیر ہی ہو گی۔ زندگی بھر اس نوجوان کے لیے ترستی رہوں گی۔ یہ خیال ہی روح فرسا تھا۔ اماں ابا کے فیصلوں نے مجھے ہمیشہ ہی احساس کمتری میں مبتلا کیا تھا۔ یہ آخری داؤ بھی وہ جیت گئے۔

جب میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہا تب بھی ابا نے ہی ضد پکڑ لی کہ وہ مجھے اتنا آزاد نہیں دیکھنا چاہتے۔ جانے بی۔ اے تک بھی کس طرح پڑھ سکی۔ وہ بھی اپنے شوق اور استادوں کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے ممکن ہوا۔ میں تو چاہتی تھی کہ سر دس کر لوں اور تعلیم بھی جاری رہے۔ مگر ابا۔ ان کو یہ گوارا نہ ہوا۔ وہ



خاندان کے طنز "بیٹی کی کمائی" کو برداشت نہ کرتے۔ اس لیے خود ہی بوڑھی ہڈیاں گھستے رہے۔

میں چوبیس برس کی ہو گئی اور کوئی اچھا رشتہ نہ آیا تو اماں بے حد فکر مند ہو گئیں۔ دراصل ہمارے گھر میں کوئی دلکشی ہی نہ تھی۔ کوئی سامانِ آرائش تھا۔ نہ عمدہ فرنیچر۔ گھر بھی مختصر تھا۔ لوگ آتے منہ بنا کر چلے جاتے۔ میری چھوٹی بہن کو خالہ بہو بنا کر لے گئیں اس سے چھوٹی پھپھو کو بہت بھا گئی۔

میری مناسبت سے خاندان میں کوئی لڑکا نہ تھا۔ اسی لیے اماں بے چاری کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ پھر جب ایک روز میں نے سنا کہ میرا رشتہ طے ہو گیا تو میں حیران سی ہو گئی۔ کوئی دیکھنے آیا نہ بات کرنے۔ معلوم ہوا اماں کی کسی ہیلے کی سہیلی کے توسط سے رشتہ ہوا ہے۔ تب میں نے پوچھا نہ کسی نے تفصیل بتائی۔ شادی کے دن نکاح کے وقت حقیقت آشکار ہوئی۔ رخصتی سے پہلے ہی میں نے اس شخص کے لیے دل میں بیزاری محسوس کی۔ اور اس کی خود غرضی سے نفرت ہو گئی۔

اس بوڑھے کو کیا حق تھا ایک جوان چنچل دل کو قید کر کے اس پر ملکیت کی مہر لگا کر، زندگی سے بیزار کرنے کا۔ اسے۔ ایک جوان بیوی مل گئی مگر اسے اس جوان بیوی کے احساسات کا خیال رکھنا ہو گا۔ میں اسے کبھی دل سے قبول نہیں کروں گی۔ پہلے دن۔ پہلی رات [illegible] اس پر اپنی نفرت ظاہر کر دوں گی۔ نتیجہ کچھ بھی [illegible] سوچ کر میں کچھ مطمئن ہو گئی۔ دل میں ابال سے اٹھتے رہے۔ دبا تی رہی۔

شادی کی رات دیکھا۔ بوڑھا تو نہیں کہا جا سکتا۔ مگر چونکہ دل سخت کر چکی تھی اس لیے پسند نہیں آئے۔ دو بچوں کے باپ ان کا کیا حق تھا کسی نوجوان لڑکی کے ارمانوں پر ڈاکہ ڈالنے کا۔ کوئی بیوہ مطلقہ پسند کر لیتے۔ حسب پروگرام ان سے صاف کہہ دیا کہ میں بچوں سے کوئی تعلق نہ رکھوں گی۔ ان کو محبت نہیں دے سکوں گی۔ خود بچوں کے باپ کی خدمت کرنے کو تیار ہوں مگر وہ اپنے لیے مجھ سے محبت کی توقع نہ کریں۔

وہ حیران ضرور تھے۔ کچھ افسردہ بھی ہوئے مگر میں جو کہہ چکی تھی اس کو لوٹانا ممکن نہ تھا۔ اس دن کے بعد سے وہ برابر والے کمرے میں رہتے ہیں۔ درمیان میں ایک دروازہ ہے۔ جو دونوں کمروں کو ملاتا ہے مگر ہم میں روزِ اوّل جیسی دوری ہے۔ بچے انہی کے پاس رہتے ہیں۔ دفتر سے آکر کافی وقت بچوں کے ساتھ گزار دیتے۔ باقی وقت اپنی اماں کے پاس رہتے۔ میں کیا کرتی ہوں، کیا کھاتی، کیا پہنتی ہوں ان کو شاید خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ کبھی خوبصورت خوش رنگ لباس پہنے ہوتی اماں جان اور بڑی آپا تعریف کرتیں میرا دل چاہتا وہ بھی دیکھیں اور ستائش کا ایک جملہ ان کے منہ سے ادا ہو جائے مگر وہ میری جانب کم ہی دیکھتے تھے خصوصاً جب میں چاہتی تھی کہ وہ دیکھیں تو وہ کتاب میں سر گھسائے جانے کیا پڑھتے رہتے۔ ان کی نظر مجھ سے زیادہ بے جان اشیاء پر رہتی میری ہی سجاوٹی سنواری چیزوں کی تعریف کرتے۔

"یہ گلدان۔ یہ گملہ۔ یہ سینری۔ یہ تصویر اس جگہ کے لیے تہلکہ مناسب ہے۔ یہ بہت بھلی لگ رہی ہے۔" یا۔

"بیگم تمہارا ذہن کافی آرٹسٹک ہے۔"

مجھے یہ چیز پسند آئی۔ خود میرے لیے پسندیدگی کے الفاظ ان کے پاس نہ تھے۔ کچھ دن بعد ہی میں نے ان کے مشاغل، عادات اور فطرت سے آگاہی حاصل کر لی مگر اول رات کے الفاظ یا ارادے جو میں نے ظاہر کیے تھے ان کا زہر اتنا تیز تھا کہ وہ نہ ان الفاظ کو بھول سکے نہ میرے ارادوں کو نظر انداز کر سکے۔ اسی لیے بچوں کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ مجھے بھی ان سے روز بروز چڑ ہوتی گئی۔ میں اماں جان کی خدمت کرتی۔ بڑی آپا کا ہاتھ بٹاتی۔ گھر کو صاف ستھرا رکھتی۔ نوکروں پر حکم چلاتی۔ مجھے گھر میں مکمل اختیار و اقتدار حاصل تھا لیکن بچے مجھے کرب میں مبتلا رکھتے۔ میں ذرا ڈانٹ دیتی تو ان کی حلق پھاڑ کر چلاتی۔ وہ روتی تو سب اس کی دلجوئی کو آجاتے۔ میں روتی تو کوئی نہ دیکھتا نہ تسلی دیتا۔ میاں صاحب تو مجھے گھر میں لا کر بھول ہی گئے تھے میں ان کی نظر کرم کو ترستی۔ کبھی دل میں ہوک سی اٹھتی۔ میری زندگی عام عورتوں کی طرح کیوں نہیں۔ شوہر و بیوی میں جو یگانگت ہوتی ہے وہ ہمارے ہاں کیوں ممکن نہیں۔ میرے کچھ کہہ دینے سے ان پر اتنا اثر ہوا ہی کیوں۔ کم از کم۔ کم از کم دنیا کے سامنے تو یہ ظاہر نہ کریں کہ ہم میں کوئی تعلق نہیں مگر وہ زندگی میں سچ کے قائل تھے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس دن کے بعد سے انہوں نے نہ تو کبھی مجھے اس بات کا اشارہ کیا نہ میری ضد اور ہٹ دھرمی پر طنز کیا۔ لگتا تھا وہ یہ بات بھول چکے ہیں۔ میرا وجود بھی۔ ہم میں جب کبھی گفتگو ہوتی وہ گھر، سامان یا اشیا کے بارے میں ہوتی۔ ایک روز وہ بے حد خوش تھے۔ صوفی کو گود میں اٹھائے گدگدا رہے تھے۔ وہ قہقہے لگاتی تو ان کے چہرے پر مسرت کی گلابی بکھر جاتی۔ آنکھیں روشن ہو جاتیں۔ دونوں باپ بیٹی بے حد مگن، مسرور ایک دوسرے میں گم تھے۔

"آپ اسے کیوں گود میں لیے پھر رہے ہیں۔ اتنی بڑی ہو

گئی ہے۔" میں نے ٹوکا۔

"ماں باپ کے لیے ان کا بچہ۔ سدا بچہ ہی رہتا ہے۔ پھر یہ تو معصوم ہے۔ ننھی منی جان۔"

"جی۔ ننھی معصوم۔" میں جل گئی۔ "کوئی مجھ سے پوچھے اس کی معصومیت۔"

"معصومیت کسی سے پوچھی نہیں جاتی وہ تو نظر آجاتی ہے۔" انہوں نے متانت سے کہا۔

"پتا نہیں۔ مجھے کیوں نظر نہیں آتی۔ مجھے تو یہ ظالم سماج کا روپ لگتی ہے۔" میرے منہ سے بلا ارادہ نکل گیا۔

فوراً ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ ہنسنے لگے۔ مجھے اور غصہ آگیا۔ "یہ اس قدر ہنسی کیوں آرہی ہے آپ کو۔؟"

"ہے ایک بات۔" وہ خوش دلی سے بولے۔

"پتا نہیں کیوں۔ سوچ سوچ کر ہنسی آرہی ہے۔؟"

"مجھے بھی بتایئے۔" میں نے اشتیاق ظاہر کیا۔ ایسے لمحے کم ہی میسر ہوتے تھے، جب وہ فرصت سے مجھ سے بات کریں۔

"بھئی، فضول سی بات ہے۔ مگر بتا نہیں مجھے کیوں ہنسی آئی۔ میرے ایک دوست ہیں شبو صاحب۔ آج ان کے گھر چلا گیا۔ ان کا نظریہ زندگی کچھ عجیب سا ہے۔ کہتے ہیں کہ گھر میں ایک خانساماں ہو تو زندگی مکمل ہوتی ہے۔ اسی کو آزمانے چلا گیا وہ تو مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوئے لیکن ان کا گھر وہ مجھے برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس قدر افراتفری اور مختلف سامان پھیلا ہوا تھا کہ۔ بیٹھنے کے لیے جگہ بھی خود ہی بنانی پڑی۔ گو کہ وہ اب بھی اسی نظریے پر قائم ہیں اور بہت مطمئن ہیں۔ اتنی افراتفری کی زندگی کو سادہ زندگی کہہ کر حقیقت پر پردہ ڈالنا چاہتے تھے۔ دراصل ہیں اپنے گھر سے مقابلہ کرنے لگا تو بہت ہنسی آئی۔ شبو بھی اس گھر کے ماحول میں گھبرائے ہوئے جو کر لگ رہے تھے مگر ڈٹے ہوئے تھے کہ خانساماں ہر مشکل کا حل ہے۔ مجھے اس گھر میں حل نظر آیا۔ نہ خانساماں۔ البتہ سامان اور مشکلیں بہت تھیں۔ تبھی ہنسی آئی ہے۔ گو کہ رونے کا مقام ہے کہ اچھا بھلا تعلیمیافتہ شخص محض ایک فضول سی ضد پر اپنی خوشیوں کو قربان کر رہا ہے۔"

"ضد۔ کیسی ضد؟" میں نے پوچھ لیا۔

"ارے بھئی۔ بیوی کسی بات پر ناراض ہو کر میکے چلی گئی ہے۔ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بیوی کی خاص اہمیت نہیں۔ زندگی صرف خانساماں کے سہارے گزر جاتی ہے اور پرسکون گزر جاتی ہے۔ میں ان کی پرسکون زندگی کا مشاہدہ کرنے گیا تھا۔"

وہ پھر ہنسے۔

"اتنی ہنسی کی بات بھی نہیں۔" میں نے کہا۔ دراصل مجھے عجیب لگ رہا تھا۔ وہ بہت سنجیدہ رہتے تھے۔

"بات یہ ہے کہ مختلف لوگوں کی ضدیں اور ہٹ دھرمیاں کا تجزیہ کر رہا ہوں۔ انجام جو بھی ہو۔" انہوں نے اچانک سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن میں نے جو قیاس لگایا ہے اس پر قائم ہوں۔"

"مثلاً۔ اور کون۔؟"

"مثلاً آپ۔ اپنی ضد میں نہ صرف اپنا بلکہ میرا سکون بھی برباد کر رہی ہیں۔"

"آپ کے خیال میں میری ضد کا انجام کیا ہوگا۔؟"

"وہی فطرت کے عین مطابق۔ آپ کی شکست۔"

"ناممکن۔" میں نے بڑے عزم سے کہا۔ "میری [illegible] میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ خیالات بدلنے والے دل [illegible] پسند نہیں۔"

ان کی آنکھوں کی بہت مدھم پڑ گئی۔ لمبا سانس لے کر ہوئی کو لے کر لیے گئے۔ مجھے غصہ آیا۔ اپنی غلطی کا اقرار کبھی نہیں کریں گے

ایک دن میں اماں جان کو سوپ پلا رہی تھی۔ ان کو دو دن سے بخار تھا۔ کمزور ہو گئی تھیں۔ آہستگی سے میرا ہاتھ ہٹا کر کہنے لگیں۔

"بیٹی۔ کچھ من کی بھی خبر ہے۔؟ اس کا خیال رکھا کرو۔ بہت چپ چپ رہنے لگا ہے۔ پہلے تو کچھ ہنستا بولتا بھی تھا۔ اب تو جیسے سب کچھ بھول گیا۔ اداس اور بے چین رہنے لگا ہے۔ صحت بھی اچھی نہیں رہی۔"

میں نے کہا۔ "اماں جان۔ مجھے تو معلوم نہیں۔ یہ صحت تو جیسی تھی ویسی ہی ہے۔"

بولیں۔ "میں ماں ہوں۔ میری نظریں پہچان لیتی ہیں۔ اب وہ ویسا ہشاش بشاش نہیں رہتا۔ کمزور ہو گیا ہے۔ بیٹی یہ تمہارا فرض ہے کہ اسے ہر طرح خوش اور مطمئن رکھو۔ مرد کی سلامتی کے لیے۔ اس کی خوشیوں کے لیے عورت کو بہت قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ ماں کے روپ میں، بیوی کی صورت میں۔ عورت کو ہی جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ میں تو اب ناکارہ ہو گئی ہوں۔ دیکھتی ہوں کہ بچوں کے کام بھی اپنے ہاتھ سے کرنے پڑتے ہیں اسے۔ بہت افسوس ہوتا ہے۔ اپنے کام تو برسوں سے وہ خود ہی کر لیتا ہے۔ ہاں۔ شاہدہ کی زندگی میں اس کا محتاج ہو گیا تھا۔ اس کے بعد تو

صبر کر کے خود کرتا ہے کسی سے کہتا نہیں۔"

"میں بھی یہی کہنے والی تھی اماں جان۔ وہ مجھ سے کچھ کہتے نہیں، بتاتے نہیں۔" میں نے صفائی دی۔

"تم کیسی بیوی ہو۔ کہ اس کے روزمرہ کے کام ابھی تک نہیں جان سکیں۔" انہوں نے شکوہ کیا۔ "میں تو معذور ہو کر رہ گئی ہوں کچھ نہیں کر سکتی۔ اس کی پریشانی دور نہیں کر سکتی تڑپ کر رہ جاتی ہوں۔" اماں جان بہت پریشان اور فکرمند تھیں۔ میں جانتی تھی ان کی پریشانی کی وجہ میں ہوں جوان کے بچوں کی ماں بننے سے انکار کر رہی ہوں۔ ان کی اطاعت سے جان چراتی ہوں۔ بس یہی وجہ ہے۔ دراصل ان کو سیدھی سادی اللہ میاں کی گائے قسم کی لڑکی سے شادی کرنا چاہیے تھی مگران کا بھی کیا قصور۔ میری نند کی ساس جو امی کے میکے کی سہیلی تھیں ان ہی نے رشتہ لگایا تھا۔ یہ سوچ کر کہ مفلسی کی ہوئی لڑکی کے بھاگ جاگ اٹھیں گے۔ وہ ان کی اور قدر کرے گی اور بچوں پر جان نچھاور کرتی رہے گی۔ غریب گھر کی لڑکی احسانوں تلے دبی رہے گی مگر میں اس قسم کی لڑکی نہیں۔ اپنے حقوق کی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔ احتجاج کر سکتی ہوں۔

ایک روز ان کے ایک چچازاد بھائی اماں جان کی خیریت دریافت کرنے کے لیے آئے۔ وہ دور کسی شہر میں رہتے تھے۔ بچی کی بیماری کا سن کر آئے تھے۔ بے [illegible] باک اور چونچال طبیعت کے تھے۔ عمر میں تو [illegible] ان کے ہر انداز سے شادی شدہ [illegible] کے لگتے تھے۔ بے تکلفی ان سے بہت جوان اور خوش [illegible] طبیعت کے ہر انداز سے شادی شدہ [illegible] کے لگتے تھے۔ بے تکلفی ان سے بہت جوان اور خوش [illegible] طبیعت کے ہر انداز سے شادی شدہ [illegible] کے لگتے تھے۔ بے تکلفی ان سے بہت جوان اور خوش خرم

رہتی ہے۔ میں نے شادی کر کے شاہدہ کی روح کو دکھ پہنچایا اور خود بھی پچھتایا۔ پتا نہیں آج کل یہ پچھتاوا اس قدر کیوں طاری رہنے لگا ہے۔ چاہتا ہوں کہ نارمل طریقے سے وقت گزاروں مگر کوئی نہ کوئی چبھن، کسک، ٹیس ذہن سے لپٹی رہتی ہے۔"

وہ چپ ہو گئے۔ بھائی جان بھی خاموش رہے۔ کمرے میں خاموشی رہی۔ پھر بھائی جان نے کہا۔

"خیر۔ اب حوصلہ کرو۔ پچھتاوے جان کے دشمن ہوتے ہیں انہیں وہم سمجھ کر نظر انداز کر دو۔"

"دراصل۔ میں جو چاہتا تھا۔ جو سمجھتا تھا وہ نہ ہو سکا۔ بچوں کو احساس محرومی سے نجات دلانا چاہتا ہوں۔ اسی تگ و دو میں ذہنی خلفشار اور مایوسی کا شکار ہو جاتا ہوں۔ بچے میرے ہیں۔ تنہا مجھے ہی ان کی دیکھ بھال کرنی ہے۔ انہیں کسی کمی کسی بے بسی کے مزاج سے دوچار نہیں ہونے دوں گا۔ یہ عزم ہی زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے آپ پریشان نہ ہوں۔ میں واقعی ٹھیک ہوں اور صحت مند۔ اور۔"

"صحت مند بھی نہیں۔ اور۔" بھائی جان نے بات کاٹی۔

"فکر مند بھی بہت ہو۔ اور فکر ہی ایک بیماری ہے جو جان کو کھاتی ہے جو جسم کو گھلاتی ہے۔ اس سے پیچھا چھڑاؤ۔ بچوں کے لیے ماں کا بندوبست تم کر چکے ہو۔ اب ماں میں مامتا پیدا کرنا تمہارا کام نہیں یہ اسی وقت ممکن ہے جب تمہاری بیوی ماں بنے۔ سمجھے۔ جب وہ تمہارے بچے کی ماں بنے گی تب تمہارے دوسرے بچوں سے قدرتی طور پر محبت کرے گی۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ فطرتاً نیک ہے۔ گو کہ اس نے سخت گیر عورت کا نقاب اوڑھا ہوا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بچے ہی اپنی کوشش سے اس عورت میں مامتا تلاش کر لیں۔"

"بچے ایسی کوشش کس طرح کر سکتے ہیں؟"

"اچھا۔ وہ نہیں کر سکتے تو تم تو کر سکتے ہو۔" بھائی جان ہنس رہے تھے۔ میں وہاں سے ہٹ گئی۔

---

ایک روز میں نے نعمان کو تھپڑ مار دیا۔ وہ تو گال پر ہاتھ رکھے حیرانی سے مجھے تکتا رہا۔ مگر صومی نے چیخ مار کر رونا شروع کر دیا۔ جونہی باپ کی صورت دیکھی ان کی طرف دوڑی اور شکایت کی کہ میں نے نعمان کو مارا ہے۔ وہ کمرے میں آئے۔ نعمان میز کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی مگر وہ ضبط کر رہا تھا کہ آنسو باہر نہ آئیں۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ وہ بے بسی سے باپ کو دیکھنے لگا۔ ان کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا۔ آنکھوں میں یکایک سرخی نمودار ہوئی۔ شعلہ برساتی آنکھوں سے مجھے دیکھ کر بولے۔

"کیا ہوا ہے نومی کو؟"

"اسی سے پوچھیے۔" میں نے بے خوفی سے کہا اور کمرے سے باہر جانے لگی۔ انہوں نے راستہ روک کر تلخی سے کہا۔

"بانو۔ ایک بات یاد رکھیے۔ اگر آپ ان سے محبت نہیں کر سکتیں۔ ان کو مامتا کی گرمی اور پیار نہیں دے سکتیں تو انہیں مارنے، سزا دینے یا جھڑکنے کا بھی آپ کو کوئی حق نہیں۔ خبردار۔ آئندہ اگر آپ نے ان پر ہاتھ اٹھایا۔ تو میں بھی اپنا حق استعمال کر سکتا ہوں اور آپ کو بتا دوں گا کہ آپ بھی اتنی ہی بے بس ہیں جتنا آپ نے بچوں کو سمجھ لیا ہے۔"

کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں داخل ہو گئے۔ میں خوف سے جم کر رہ گئی۔ اتنے سخت لہجے میں انہوں نے آج تک بات نہیں کی تھی۔ یہ بچے درحقیقت میرے دشمن ثابت ہو رہے تھے اور میری نفرت ان سے بڑھتی جا رہی تھی۔ جبھی اب مجھ سے دور رہنے لگے تھے۔ شاید ان کے باپ نے منع کیا ہو گا۔ مگر صومی کو چین کہاں۔ ابھی میں سوئی تھی کہ وہ کمرے کے دروازے کو پُرشور آواز سے کھولتی ہوئی اندر آ کر گری۔ دروازہ بند نہ تھا اس لیے اس کی توقع کے خلاف کھلتا چلا گیا اور وہ اپنے ہی زور میں گرتی میں ہڑبڑا کر اٹھی۔ کیا اچھا خواب دیکھ رہی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی صومی کی رونی صورت اور پہاڑ سا کھلا منہ نظر آیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ فوراً بھی نہ کر سکی۔ اٹھ کر اسے زور سے جھنجھوڑا۔ اور کمرے سے باہر لے جا کر چھوڑ دیا۔ دروازہ اندر سے بند کر کے بستر پر گر گئی۔ اف۔ مجھے کب چین ملے گا؟ میں ہانپنے لگی تھی۔ صومی کی چیخیں زمین آسمان ایک کر رہی تھیں۔ باہر شور مچا رہا تھا۔

"ہائے یہ چھوٹی بی بی کو کیا ہو گیا؟"

ارے ارے۔ کہاں ہیں؟ مگرمچھ نے چوٹ لگی؟ دھکا دیا تھا؟ امی نے مارا ہے؟؟ ہیں؟ ہائے کس بے دردی سے مارا ہے۔ چار انگلیاں گال پر ابھر آئی ہیں۔" بڑی آپا مارے ہمدردی کے مبالغے پر اتر آئیں۔

"اے اللہ تو کسی بچے کو بن ماں کا نہ کرنا۔" مہمان آئی ہوئی بڑی بی پوپلے منہ سے کہہ رہی تھیں۔

"ارے ارے خون بھی نکل رہا ہے۔ بی بی دیکھیے۔" بوا کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

"لاؤ لاؤ۔ ارے پانی لاؤ بھئی۔ اٹھا کر لے چلو۔ چلو چلو۔ ہائے معصوم بچی۔ میں صدقے قربان۔" کہتی ہوئی بڑی آپا کہیں دور چلی گئیں۔

سب آوازیں دور ہو گئیں۔ خون نکلنے کا سن کر میں کچھ ڈر سی گئی۔ پھر۔ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ کہیں ذرا سا چھل چھلا گیا ہو گا۔ بات کا بتنگڑ بننے میں دیر ہی کیا لگتی ہے۔ سونے کی کوشش کرتی رہی۔ پوری دوپہر گزر گئی۔ شام ہو گئی تو میرے باہر جانے سے پہلے وہ اندر آئے۔ بے حد مضمحل اور مایوس تھے۔ دکھی لہجے میں کہنے لگے۔

"بانو۔ اتنی بے درد نہ بنو۔ ایسا سنگدلی کا مظاہرہ تو کوئی پالتو جانوروں کے ساتھ بھی نہیں کرتا۔ میں تو تم کو بے حد روشن خیال سمجھتا تھا۔ لگتا ہے تعلیم کو بھی ضائع ہی کیا ہے۔ محبت نہ سہی۔ لیکن اتنی نفرت بھی نہ کرو کہ لوگ تم سے متنفر ہو جائیں۔"

"مجھے کسی کی نفرت کی پروا نہیں۔" میں نے لاپروائی سے کہا

"لیکن میں نے اسے مارا نہیں۔ صرف کمرے سے نکالا تھا۔ وہ میری نیند خراب کر رہی تھی۔"

"تمہاری نیند اس کے خون سے زیادہ قیمتی نہیں۔" انہوں نے تلخ سے کہا۔ "جانتی ہو تمہارے دھکا دے کر گرانے سے اس کا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ۔ زخمی ہو گئی۔ تم نے باہر نکل کر دیکھا تک نہیں۔ کم از کم ظاہری ہمدردی ہی کر لیتیں۔"

"مجھے دکھاوے کا شوق نہیں۔" میں چڑ گئی۔ "اور میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔ میں صفائی دینا نہیں چاہتی لیکن چونکہ آپ کے خیال میں میں بچوں کی دشمن ہوں اس لیے ترس بھی نہیں کروں گی میں ظالم، جاہل بے درد ہوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ آپ سے میں کچھ مانگتی بھی نہیں۔ پھر بھی کوئی مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ کس جہنم میں جھونک دیا۔"

کہتے ہوئے مجھے زور کا رونا آ گیا۔

"جہنم۔" وہ بھی تلخ سے بولے۔ "جہنم تم نے خود ہی اپنے لیے خریدا ہے۔ میں تو تم سے جنت کی توقع کرتا ہوں۔ تم اسے جہنم بناتی ہو۔ سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔"

"میں کوئی نصیحت نہیں سنوں گی۔" میں نے کان بند کر لیے

"خدارا مجھے بھی جینے کا حق دیں۔ میں ان بچوں سے عاجز ہوں۔ مجھے ان سے نجات دلا دیں۔ اتنی ہی درخواست ہے میری۔"

"ہم بھی تم سے جینے کا حق چاہتے ہیں۔ وہ خفگی سے بولے۔

"تو میرا فیصلہ کر دیں۔ اب میں رہوں گی یا وہ لوگ۔"

جوش میں میرے منہ سے نکل گیا۔ بعد میں فوراً ہی پچھتائی۔ اگر وہ مجھے گھر سے نکال دیں تو میرا مستقبل کیا ہو گا۔ وہی تنگ و تاریک ماحول اور دھندلی فضا — روشنی سے عاری۔ امید سے خالی۔

"فیصلہ میں کر چکا ہوں۔ وہ سختی سے کہہ رہے تھے۔ تم کو یہیں اسی جہنم میں رہنا ہے۔ بچوں کی پرورش کرنا ہے۔ اور ان کے سامنے کام بھی اب تمہیں ہی کرنے ہیں۔ میں نے تم کو ڈھیل دی ہے محض اس امید میں کہ تم کو میری قدر ہو۔ میرے احساسات سے شناسائی ہو جائے۔ اب۔ اپنے طرز عمل کو فوراً تبدیل کر لو۔ ورنہ میں جبر کا قائل نہیں۔ لیکن تم مجھے اسی ناپسندیدہ فعل پر مجبور کر رہی ہو۔ آئندہ۔ میں تم کو اپنی مرضی کے تابع دیکھوں۔ یہ ہے میرا فیصلہ۔"

کہہ کر مجھے حیران و ساسیہ چھوڑ کر وہ باہر نکل گئے۔ وہ سختی کر سکتے ہیں۔ جبر بھی کر سکتے ہیں۔ مجبور بھی کر سکتے ہیں۔ میں جانتی تھی۔ مجھے اس گھر کی روشن فضا، شاندار ماحول پسند تھا۔ میں اب ابا کے اس گھر میں جانا نہیں چاہتی تھی ایسی ناشکری تو نہیں تھی۔ میکے میں بیٹھی شادی شدہ لڑکی کی کوئی قدر نہیں۔ نہ ماں باپ کرتے ہیں نہ دنیا والے سراہتے ہیں۔ خواہ سسرال میں کتنے ہی مظالم ہوں مگر معاشرہ لڑکی کو سسرال میں "اپنے گھر" میں ہی دیکھنا پسند کرتا ہے۔ میں تو یوں بھی نکو بن جاتی۔ کہ کوئی میرے جذبات کو قدر کی نگاہ سے نہ دیکھتا شادی کے دن ابا پر اعتراض اور میری قسمت پر افسوس کرنے والے بھی اب مجھے خوش قسمت کہنے لگے تھے۔ میں اگر کبھی ہفتے میں دو بار اماں سے ملنے چلی جاتی۔ یا اداسی کو دور کرنے کے لیے کچھ دیر پرانی یادوں کو دہرانے کے لیے ہی جاتی تو اماں گھبرا جاتیں۔ ابا پریشان ہو جاتے۔

اماں مجھے نصیحت کرتیں کہ میرا بار بار میکے آنا مناسب نہیں شاید داماد اسے پسند نہ کرے اور یہ کہ مجھے ہر حال میں شوہر کی خوشنودی کا خیال رکھنا چاہیے۔ وہ بڑے پیار سے نعمان اور صومی کی خیریت دریافت کرتیں اور ہر بار اصرار کرتیں کہ کبھی میں ان کو بھی لے آیا کروں۔ جیسے وہ ان کے حقیقی نواسے نواسی ہوں ایسی بناوٹی باتیں مجھے اچھی نہیں لگتی تھیں۔ اماں ابا مجھے مہمان سمجھتے تھے۔ خاطر مدارات کرتے نہ تھکتے۔ ان کو ہر بار یہ افسوس ہوتا کہ وہ میری خاطر خواہ تواضع نہ کر سکے۔ انہوں نے میرے جسم پر نئی لباس ہی دیکھا تھا۔ زیورات ہی دیکھے تھے اور بے حد خوش اور مطمئن تھے۔ داماد کی تعریف سانس کے ساتھ ہوتی۔

انہوں نے میری آنکھوں کی اداسی کو محسوس کیا نہ میرے اندر کی ویرانی کا اندازہ لگایا۔ کبھی پوچھا تک نہیں کہ بیٹی تو خوش تو ہے۔ خود ہی قیاس کے ذریعے میری خوشی اور خوش قسمتی پر نازاں ہوتے رہے۔ میری بھی ہمت نہ پڑی کہ ان کی خوش فہمی کو جھٹلاؤں۔ بڑھاپے میں انہیں دکھ دینے یا پچھتاوے میں مبتلا کرنے

کا حوصلہ نہ تھا۔ وہ خوش تھے۔ مجھے بھی اپنی مطمئن زندگی کا مظاہرہ کرنا تھا۔ اب مجھے اسی جہنم میں زندگی گزارنی تھی اور۔ شوہر کی اطاعت میں ان کے لاڈلوں کی خدمت بھی کرنا تھی۔

میں نے رفتہ رفتہ ان کے بیشتر کام اپنے ذمے لے لیے۔ مگر میاں صاحب پھر بھی خوش نہ تھے۔ مطمئن نہ تھے۔ وہ مجھ سے بہت کم مخاطب ہوتے۔ بس بچے، اماں جان اور مہمان یہی ان کی توجہ کے مرکز بنے رہتے۔ میں بھی اب کچھ نہ کہتی۔ بچے شور کرتے تو دل پر جبر کر کے رہ جاتی۔ کبھی غصہ آتا تو روتی رہتی۔ نیند اُڑ جاتی۔ دل کی ویرانی دو چند ہو جاتی۔ آنکھیں سُرخ اور پپوٹے سوج جاتے مگر انہوں نے کبھی یہ بھی نہیں کہا کہ کیا تمہارے سر میں درد ہے؟ یا اتنی سست کیوں ہو؟

انہوں نے میرے وجود کو فراموش کر دیا تھا۔ حالانکہ ہر وقت، ہر جگہ، ہر کام میں ان کو میرا وجود نظر آتا تھا۔ وہ بغور بچوں کو دیکھتے کہ انہوں نے مناسب لباس پہنا ہے۔ ان کا جسم صاف ستھرا ہے؟ جوتے پالش شدہ ہیں۔ اسکول یونیفارم وقت سے پہلے استری کر کے رکھا ہے۔ گھر میں بھی ہر جگہ صفائی رہتی۔ کھانے میں بھی کوئی خامی نہ ہوتی۔ ان کو کہیں بھی کوئی خامی نظر نہ آتی۔ پہلے بھی یہی گھر، یہی بچے تھے۔ اگر کچھ فرق تھا۔ تو وہ میں تھی۔ میں کسی ستائش کی منتظر نہیں رہتی مگر ادھر تو برف جمی رہتی تھی۔ دل کی ویرانی دو چند ہو جاتی۔ آنکھیں سُرخ اور پپوٹے سوج جاتے مگر انہوں نے کبھی یہ بھی نہیں کہا کہ کیا تمہارے سر میں درد ہے؟ یا اتنی سست کیوں ہو؟

انہوں نے میرے وجود کو فراموش کر دیا تھا۔ حالانکہ ہر وقت، ہر جگہ، ہر کام میں ان کو میرا وجود نظر آتا تھا۔ وہ بغور بچوں کو دیکھتے کہ انہوں نے مناسب لباس پہنا ہے۔ ان کا جسم صاف ستھرا ہے؟ جوتے پالش شدہ ہیں۔ اسکول یونیفارم وقت سے پہلے استری کر کے رکھا ہے۔ گھر میں بھی ہر جگہ صفائی رہتی۔ کھانے میں بھی کوئی خامی نہ ہوتی۔ ان کو کہیں بھی کوئی خامی نظر نہ آتی۔ پہلے بھی یہی گھر، یہی بچے تھے۔ اگر کچھ فرق تھا۔ تو وہ میں تھی۔ میں کسی ستائش کی منتظر نہیں رہتی مگر ادھر تو برف جمی رہتی تھی۔ میری راہیں تڑپتے اور دل سلگتے گزرتے۔ صرف ایک بار جب اماں جان کو ناشتا کرا رہی تھی تو اتفاقاً میں نے سنا۔ بڑی آپا ان سے پوچھ رہی تھیں۔

"اونی محسن یہ کیا کر رہے ہو۔؟"

"بڑی آپا۔ حمی کی فراک کا بٹن ٹوٹ گیا ہے ٹانک رہا ہوں۔"

"ارے یہ کہیں مردوں کے کرنے کے کام ہوتے ہیں۔ بڑی آپا نے خفگی سے کہا۔ "مجھ سے کہتے۔ میں ٹانک دیتی۔"

"نہیں نہیں آپا۔" انہوں نے جلدی سے کہا۔ "ایسا مشکل کام تو ہے نہیں، کر لوں گا۔ اسکول کو دیر نہ ہو جائے۔ اس لیے کرنے لگا۔ انسان کو ہر کام آنا چاہیے۔"

"دلہن کو چاہیے تھا استری کرتے وقت دیکھ لیتیں۔" بڑی آپا نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"دراصل یہ ابھی کوٹا ہے اور ویسے بھی — وہ صبح زیادہ مصروف ہوتی ہیں۔ بچوں کو ناشتا دینے اور اماں کے لیے دلیا وغیرہ بنانے میں وقت لگتا ہے۔ اس لیے ان سے نہیں کہا۔

"اچھا لاؤ۔ مجھے دو۔"

بڑی آپا نے شاید ان سے سوئی دھاگہ لے لیا تھا۔

"میں کو کبھی بہت شرمندگی محسوس کرتا ہوں بڑی آپا۔ اس گھر میں واقعی بے حد کام اور مسائل ہیں۔" وہ کہہ رہے تھے۔ "میں ان کو اتنی محنت کرتے دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہوں۔ اپنی خود غرضی پر نادم ہوتا ہوں۔ میں خود ان کی مدد بھی نہیں کرتا بلکہ پہلے جو کام کر لیتا تھا وہ بھی انہیں ہی کرنے ہوتے ہیں۔"

"کبھی ایمان کی بات ہے محسن۔ تمہاری دلہن محنتی اور ذمہ دار ہے۔ مزاج میں ذرا رکھ رکھاؤ ہے مگر وہ بھی اب کم ہو گیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ پرائی اولاد کو کوئی عورت اپنی اولاد نہیں سمجھتی۔ اپنی اولاد کی تو بات ہی اور ہوتی ہے۔ اور وہ خواہ اپنی اولاد کو مارے۔ پیٹے۔ سزا دے۔ کوئی دخل نہیں دیتا۔ سب ماں کو حق بجانب ہی سمجھتے ہیں۔ یہی بات ہے۔ سوکن کی اولاد کو پالنا اور توجہ دینا ہی بڑے ظرف کی بات ہے۔ مامتا تو تبھی بیدار ہوتی ہے جب عورت خود ماں بنے۔ بس اس بات کو دلہن نہیں سمجھا۔ دلہن نے خود کو کافی حد تک بدل لیا ہے۔ اب بننے کی دیر ہے کہ وہ ان بچوں سے بھی پیار کرنے لگیں گی۔"

اماں جان خاصی سمجھدار تھیں۔ ان کی قوتِ سماعت بھی کم ہو گئی تھی اس لیے وہ یہ گفتگو نہیں سن سکی تھیں۔ میری تو ساری توجہ ادھر ہی تھی اس لیے ایک ایک لفظ میری سماعت سے گزر رہا تھا۔ دل میں ذرا خوشی کی کونپل نمودار ہوئی کہ ان کو میری محنت کا اعتراف ہے۔ چلو مجھ سے نہ سہی اپنی بہن سے تو کہا۔ لیکن بڑی آپا جو ہمیشہ پڑھاتی تھیں اس کو سن کر کوفت ہوئی۔ بچے ان کے بچوں سے محبت کرنا پسند نہیں۔ یہ بات کوئی مانتا ہی نہیں۔ زبردستی ہے کوئی۔

اس دن وہ آفس نہیں گئے۔ اپنے کمرے میں ہی رہے۔ کچھ پڑھتے رہے۔ شام کو دروازہ کھولا۔ تو چہرے پر اداسی اور چال میں اضمحلال تھا۔ چپ چاپ اماں جان کے کمرے میں چلے گئے۔ مجھے ادھر جانے کا موقع نہیں ملا۔ کچھ پڑوسنیں آ گئی تھیں ان سے گپ شپ کرتی رہی۔ رات کو ہر روز کی طرح میں ان کے کمرے میں بستر درست کرنے گئی۔ سفید چادر پر شکنیں تھیں۔ اس کی شکنیں مٹاتے ہوئے دل بھر آیا۔ کمرہ اداس اداس تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی انسانوی ماحول کے بجائے ویرانی کا تاثر دے رہی تھی۔ میں نے دیکھا نہیں۔ بے آواز وہ کمرے میں آگئے مجھے دیکھ کر درشتی سے بولے۔

"کیا بات ہے۔ کیوں آئی ہو؟" میں گھبرا گئی۔ پتا نہیں کس کا غصہ مجھ پر اتارنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ "بستر درست کرنے آئی تھی۔"

"اچھا، اب جائیے۔" انہوں نے رکھائی سے کہا۔ میں جانے لگی تو پھر بولے۔ "اپنا بستر میں خود ہی درست کر لیا کروں گا۔ آئندہ زحمت نہ کیجیے گا۔ میں اپنے کمرے میں آپ کی موجودگی برداشت نہیں کروں گا۔"

الفاظ تھے یا سانپ کی پھنکار۔ کوڑے کی طرح شدت سے احساسات پر پڑے تھے۔ شدت درد سے میں لڑکھڑا گئی اور حیران نظروں سے ان کو دیکھنے لگی۔ میں نے آج تو کوئی ایسی بات کی بھی نہیں تھی کہ اس کا ردِ عمل اتنا شدید ہوتا۔ میں وجہ جاننا چاہتی تھی لیکن وہ کچھ بتانے سے پہلے مڑ کر باتھ روم میں چلے گئے۔ میں کمرے میں آئی تو ساری دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ آج سے پہلے بچوں پر سختی کے معاملے میں وہ مجھ سے اُلجھتے تھے۔ اس کے علاوہ اور کسی بات پر کبھی ناراض نہیں ہوئے تھے۔ ان کے کمرے کی صفائی پہلے بھی میں کرتی تھی۔ کبھی انہوں نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ آج کیا ہوا تھا۔؟ بہت سوچا کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ بڑی آپا سے جو بات ہو رہی تھی۔ میں تو اسی پر خوش ہو گئی تھی کہ ان کو میری مصروفیات اور محنت کا احساس تو ہے۔ مگر واہ رے نصیب۔ کہ کس وجہ سے وہ چھوٹی سی خوشی بھی قائم نہ رہی۔ اس دن کے بعد پھر میں نے ان کے کمرے میں قدم نہیں رکھا۔ پتا نہیں کون صفائی کرتا تھا۔ بستر کون درست کرتا تھا۔

میں نے اس دن سے تو یہ قطعی طور پر ہٹا لی۔ وہ بھی اس دن کے بعد شاید اس بات کو بھول گئے۔ تو ذلت کا شدید احساس ہوا تھا۔ اس لیے ان سے بات کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ مگر وہ کسی خاص بات پر مخاطب ہو جاتے تو مختصر جواب دے کر میں اِدھر اُدھر ہو جاتی۔ کہ ان کو مجھ سے ہمکلام ہونے کی زحمت نہ اٹھانا پڑے۔ تھوڑی سی گفتگو میں جو بے تکلفی تھی۔ وہ اب باقی نہیں رہی اور دونوں کے درمیان ایک حجاب قائم ہو گیا۔ وہ تو شاید محجوب ہونا چاہتے بھی تھے۔ مگر میں ایسا موقع آنے ہی نہ دیتی تھی۔ انہی دنوں اماں جان کی بڑی بیٹی کی لڑکی اماں جان کو دیکھنے مع اپنے شوہر کے ہمارے ہاں آئی۔ میری بڑی نند دو سات پا چکی تھیں۔ ان کے بچے ددھیال میں تھے۔ یہ لڑکی شادی کے بعد پہلی بار آئی تھی۔ میں اس سے مل کر بہت خوش بھی ہوئی۔ حیران بھی۔ وہ مجھ سے کچھ چھوٹی ہی تھی۔ مگر اس کے شوہر محسن کے ہم عمر تو ضرور ہوں گے۔ بے حد شوخین مزاج لگتے تھے۔ ریشمی قمیص ریشمی رنگین رومال گلے کی زینت۔ کھڑے کھڑے کر شیو کرتے تھے۔ شوخ رنگ کا لباس پسند کرتے تھے۔ نک سک سے درست رہتے تھے۔ اور جوان لڑکوں جیسا مذاق کیا کرتے مجھے ان کی یہ باتیں قطعاً پسند نہیں تھیں۔ میرے میاں سنجیدہ انسان تھے۔ جوان نہیں تھے تو بوڑھے بھی نہیں تھے۔ لیکن میں نے کبھی بھی ان کو چھچھوری باتیں یا مذاق کرتے نہیں سنا۔ سیما ان کے ساتھ خوش تھی۔ اس کا اندازہ تو ہو ہی گیا تھا۔ سیما کے میاں جب سیر و تفریح کے لیے یا جب کسی ضرورت سے باہر چلے جاتے۔ تو ہم کو باتوں کی فرصت ملتی۔ ہم خوب گھل مل کر باتیں کرتے۔

سیما دلچسپ لڑکی تھی۔ سب سے محبت کرتی تھی۔ کبھی کبھی وہ باتیں کرتے کرتے بے چین سی ہو جاتی۔ اور ابھی آتی ہوں کہہ کر چلی جاتی۔ ایک دن میں نے پوچھ لیا۔

"تم ایک دم سے کہاں بھاگ جاتی ہو۔"

وہ ہنس دی۔ "وہ بلاتے ہیں۔"

"بلاتے ہیں۔؟ میں نے تو اُن کی آواز نہیں سُنی۔" میں حیرانی سے اُسے دیکھتی رہی وہ شرما گئی۔

"آواز دے کر بلاتے نہیں۔ بلکہ مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کو میری ضرورت ہے۔ سیٹی بجاتے ہیں۔"

"اچھا۔ جس طرح کتے کو بلایا جاتا ہے۔" مجھے غصہ آنے لگا۔

نہیں۔ دراصل ان کی عادت ہے۔ جب بھی انہیں کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ نہ ملے تو تلاش کے دوران سیٹی بجاتے رہتے ہیں۔ میں سمجھ جاتی ہوں۔ اور جا کر چیز دے آتی ہوں۔"

میں تعجب سے اُسے دیکھتی رہی۔ ایک دن ہم دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ تو وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس کے میاں گئے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا بھی اب کیا بے چینی ہے۔ اب تو سیٹی بھی نہیں بجی۔"

"شاید وہ آ گئے ہیں۔" اس نے کہا۔

"نہیں تو۔ ابھی نہیں آئے۔"

"دور سے قدموں کی چاپ آ رہی ہے۔"

"دور سے۔ تم کو کیسے خبر کہ تمہارے میاں کے قدموں کی آواز ہے۔؟"

"میں پہچانتی جو ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"چاپ کی آواز پہچانتی ہو۔؟" میں پریشان ہو گئی تھی۔

"نہیں جی ان کی چاپ نہیں پہچانوں گی۔ تو اور کس کی پہچانوں گی۔ بھلا۔؟"

وہ پھر زور سے ہنسی اُسی وقت اُس کے میاں کو اندر آتے دیکھ کر میں حیرت میں گم ہو گئی۔ دنیا میں بھی کیسے کیسے عجوبے ہیں۔ میں تو محسن کی آواز بھی اتنی دور سے نہ پہچانوں۔ قدموں کی چاپ تو خیر ناممکن۔

وہ اپنے شوہر کی دوسری بیوی تھی۔ انہوں نے پہلی بیوی کے انتقال کے سال بھر بعد ہی سیما سے شادی رچالی تھی۔ ان کی پہلی

بیوی کے چار بچے تھے۔ ایک سیما کا بھی تھا جسے وہ اپنی ساس کے پاس چھوڑ آئی تھی۔

"تم ان بچوں کو برداشت کیسے کرتی ہو۔؟" میں نے پوچھا۔

"جیسے آپ کرتی ہیں۔"

"میں تو نہیں کرتی۔" میں نے صفائی سے کہا۔ "مجبور ہوں۔ کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آتا۔"

"تب آپ کو ماموں سے محبت نہیں۔ اور آپ میں مامتا کے لحاظ کی بھی کمی ہے۔" وہ سادگی سے سچ بولی تھی۔ میں اس کو دیکھتی رہی۔ وہ میرے گلے میں بانہیں ڈال کر معافی مانگنے لگی۔

"دراصل تمہارے لیے کوئی کالج کا چھوکرا مناسب رہتا۔" میں نے اسے کریدا۔ وہ منہ بنانے لگی۔

"کالج کے چھوکروں کا کیا بھروسا موہانی جان۔ عشق لڑانے میں ان کو مہارت ہوتی ہے۔ میں تو عمر بھر روتی رہتی۔ نوجوان شوہر سے بڑی عمر کا شوہر بہتر رہتا ہے۔ آپ خود ہی تجربے کار ہیں۔ بیوی کو خوش رکھتا ہے۔ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ دراصل ہمیں تو حفاظت کی ہی خواہش ہوتی ہے۔ اور جب ہر دم سر پر کار ہے کہ جوان مرد جانے کس کی زلفوں کا اسیر ہے تو زن بیچارہ غمخوار ہو جاتی ہے۔"

سیما سمجھدار بھی تھی اور سمجھوتوں کی قائل بھی۔ مجھے دور اندیشی نہیں آتی تھی۔

"مگر تم کو اپنے شوہر پسند آگئے تھے۔؟ جب پہلی بار تم نے انہیں دیکھا تھا تو کیسا لگا۔ دل میں کہتی ہو گی کس بڈھے سے قسمت پھوٹی۔" میں نے مذاق میں بات ٹالنی چاہی تھی وہ سنجیدہ ہو گئی پر مان کر بولی۔

"بڈھے کیوں ہوئے۔ اور جب تو پہلے ہی معلوم تھا۔ ہماری گلی میں ہی ان کا بھی مکان ہے۔ ان کی بیوی کو میں جانتی تھی۔"

"جانتے بوجھتے تم نے۔" میں افسوس کے عالم میں اس کو دیکھنے لگی۔

"بس میری قسمت ان کے ساتھ بندھی تھی۔ سو صبر و شکر کی بندی تھی۔"

"تو۔ تم کو ان کے بچوں سے لگاؤ کیسے ہوا۔؟" میرے سوال پر وہ پھر سے ہنسنے لگی۔

"میں انسان ہوں۔ اور ایک عورت ہوں موہانی جان۔ اللہ میاں نے عورت کو بڑا وسیع دل اور پاکیزہ جذبات عطا کیے ہیں اسے ماں کا رتبہ دیا ہے۔ جو سب سے افضل ہے۔ میں خود بچہ پیدا کرنے سے پہلے ہی ماں بنا دی گئی۔ تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ سچ یہ رتبہ۔ یہ فضیلت۔ میری تو خوش قسمتی کی کوئی حد نہ رہی۔ میں سوچتی تھی۔ اگر میں بچہ نہ پیدا کر سکی۔ تب بھی کوئی تو مجھے جب ماں کہہ کر پکارے۔ اس لیے میں نے تو پہلے دن ہی ان کے بچوں کو گلے سے لگا لیا۔ چھوٹے کو گود میں لے کر تو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے وہ میرا ہی بیٹا ہو۔ میرے جسم میں گرم گرم لکیریں سی بننے لگیں۔ اس وقت نہیں مگر بعد میں سچ مچ کی ماں بننے کے بعد مجھے علم ہوا۔ کہ یہ مامتا کی گرمی تھی۔ اور میں شاید شادی کی رات کو ہی ماں بن گئی تھی۔"

"پتا نہیں تم کو یہ احساس کیسے ہوا۔؟" میں سوچ میں گم ہو گئی سیما کا احساس میرے جذبات سے مختلف تھا۔ میں غلطی پر تھی سیما وہ مجھ سے برتر تھی۔ عورت ہونے کے باوجود کچھ فرق ہم میں تھا۔

"فکر نہ کریں۔ آپ ماں بنیں گی تو مامتا کی گرمی خود بخود پیدا ہو جائے گی۔"

"میں ماں بننا ہی نہیں چاہتی۔"

"ایں۔؟" وہ اچھل پڑی۔ "مذاق نہ کریں۔ دنیا کی کون عورت ہو گی۔ جو ایسی فطرت کے خلاف خواہش کرے۔ نہیں نہیں۔ یہ تو عورت کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے موہانی جان۔ سچ سچ آپ کو کیا ماموں سے محبت نہیں۔؟ آپ کمال کرتی ہیں۔"

میں نے اسے بتلایا۔ دل میں ابال سا اٹھ رہا تھا۔ سچ بتلا دیا۔ مجھے اپنے شوہر سے لگاؤ نہیں وہ بوڑھے ہو گئے ہیں۔ میں جوان ہوں اور شوخ و چنچل شوہر کی خواہش مند۔ اس کے علاوہ بھی سب کچھ بتلا دیا ایک اجنبی جو مجھے سمجھانے کے لیے جا رہی تھی۔ اور میں زبان کو روکنے کی طاقت نہ رکھتی تھی۔ اپنا حال کھول کر رکھ دیا۔ وہ ٹکر ٹکر مجھے گھورتی رہی بے یقینی اس کی آنکھوں میں تحریر تھی۔ میں چپ ہوئی تو وہ سوچ میں گم تھی۔ پھر بولی تو حیران انگیز بے یقینی کا اظہار کرنے لگی۔

"سب کچھ نہیں پایا جا سکتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ آپ سے بڑھ کر کفران نعمت کسی نے نہیں کیا ہو گا۔ اور ماموں۔ وہ انسان نہیں فرشتہ ہیں۔ جو محض آپ کی خوشی کے لیے اتنی بڑی قربانی دے سکتے ہیں۔ آپ ایک فرشتے کی قدر نہیں کر سکیں۔ انہوں نے آپ کو پورا اختیار دے دیا اور آپ سے کچھ مانگا نہیں۔ کوئی خواہش نہیں کی۔ جبر کیا۔ کسی پر ظاہر ہونے دیا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ میں یقین کروں تو کیسے۔"

"مجھ سے مانگتے کیسے نہیں۔ اماں کی خدمت۔ بچوں کی چاکری گھر بھر کی نوکری کون کرتا ہے۔؟ میں کرتی ہوں۔ وہ اسی لیے مجھے بیاہ کر لائے تھے سیما۔ انہوں نے سارا اختیار مجھے خیرات میں نہیں دیا۔ تھوک کر ٹھیک لین دین کا سودا ہوا ہے۔"

"موہانی جان۔ یہ سودا تو ہر شخص کرتا ہے۔ پہلی شادی بھی مرد اسی لیے کرتا ہے۔ دوسری بھی یہی لیے کرتا ہے۔"

"گویا عورت صرف ایک ملازمہ ہے۔ وہ محض خدمت گزار ہے۔"

"نہیں نہیں۔ ملازمہ کو حقوق کب ملتے ہیں۔؟ اختیار کون دیتا ہے تحفظ کب نصیب ہوتا ہے۔ آپ کو ماموں کا نام ملا ہے۔ ان کی پوزیشن میں آپ بھی حصہ دار ہیں۔ ملازمہ اور بیوی میں تو بہت فرق ہوتا ہے۔ بلکہ بیوی کو تو ہر ہر قدم پر قربانیاں دینی ہوتی ہیں۔ ملازمہ پر کوئی فرض تو لاگو نہیں ہوتا۔ آپ ملازمہ ہوتیں تو اس گھر میں رہنے کی۔ یہاں کے لوگوں کی خدمت کی پابند نہ ہوتیں۔ جب دل بھر جاتا۔ ہاتھ جھاڑ کر دوسرے گھر کی راہ لیتیں۔ جیسا کہ باقی تنخواہ دار لوگ کرتے ہیں۔ کیا آپ اس گھر کو چھوڑ کر جا سکتی ہیں۔؟"

"یہی تو مجبوری ہے۔ نکاح کا بندھن بہت مضبوط ہے۔" میں کمزور ہو گئی تھی۔ مجھے دلائل دینے نہیں آرہے تھے۔ سیما ہنسنے لگی۔ "فرق صاف ظاہر ہے۔ ملازمہ پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ نکاح کو مضبوط بندھن مانتی ہیں۔ مگر جس سے نکاح ہوا ہے۔ اس سے بیزار ہیں۔ اگر ماموں سے آپ کو نفرت ہے تو علیحدہ ہو جائیں اور اپنی مرضی کی زندگی گزاریں۔ آپ کو تو یہ بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔"

"اتنا آسان ہے کیا۔؟" میں چڑ گئی۔ سیما سے مقابلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ میں سمجھ گئی تھی۔ "کنواریوں کو تو شوہر نصیب نہیں مجھے کون پوچھتا۔ اور میں کس کس سے کہتی پھروں گی کہ میں شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی اس زندگی سے دور ہوں۔ کون یقین کرے گا۔"

"تو پھر ماموں کی فرشتگی پر یقین کر کے ان کی بن جائیے۔ یوں بھی نکاح تو ماتی ہیں۔ پھر یہ بناوٹی دوری کا کیا مطلب۔ اور اتنے دن میں تو ویسے بھی۔ آپ کو ماموں کی خوبیوں کا اندازہ ہو گیا ہے۔ اور سچ بتا دوں۔؟ آپ کو ان سے محبت بھی ہو گئی ہے۔"

"چل۔ جھوٹی۔" میں تلملا گئی۔

"چلیے نہ مانیں ہٹ دھرمی کا علاج بھی کیا ہے۔ محبت نہ سہی تو ان کی اطاعت کیسے کرتیں۔ بلکہ آپ کو تو ضد قائم رکھنی چاہیے تھی۔ ہر بات پر اختلاف کرنا تھا۔ ان کے فیصلے کی پروا ہی نہ کرنی چاہیے تھی۔ تب میں مانتی۔"

میں بڑبڑا کر اٹھ گئی۔ سیما سے جیتنا مشکل تھا۔ لیکن اس کی دلیلیں میرے ارادوں کو۔ میری ضد کو نفرت کے جذبے کو کمزور کر رہی تھیں۔ سیما اب میرا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہ تھی۔ میں صحن میں آ گئی تو وہ بھی آ گئی۔ میں ادھر ٹہلنے لگی۔ اماں جان کے پاس جا بیٹھی۔ وہ بھی پہنچ گئی۔ اور دبی زبان سے گول گول الفاظ میں مجھے نصیحت کرنے لگی۔ آخر میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ میں نے اسے روداد غم سنا کر غلطی کی تھی۔ وہ دلیلیں دے رہی تھی۔ ازدواجی زندگی کے فرائض پر لیکچر دے رہی تھی۔ میری غلطیاں گنوا رہی تھی۔ میں چڑ گئی۔

"ارے مجھے ہی ساری نصیحتیں کرو گی۔ اپنے ماموں سے کہو گی۔ انہوں نے تو اب اپنے کمرے میں میرا داخلہ بھی بند کر دیا ہے۔ داخلہ بند کر دیا ہے۔ انہوں نے کمرے کو مقفل تو نہیں کیا کہ آپ جا ہی نہ سکیں۔"

"ارے واہ۔ اتنی سختی سے حکم دیا تھا۔ میں تو ڈر ہی گئی تھی۔" "آپ ان کے احکام کی بجا آوری کرتی ہیں۔ ان کی اطاعت کرتی ہیں۔ ان کی اماں کی خدمت، گھرداری اور بچوں کی دیکھ بھال بھی کرتی ہیں نا۔؟ تب تو وہ آپ کو اہمیت دیتے ہی ہیں۔ اب آپ کے قدم مضبوط ہیں۔ آپ اپنے حقوق کے لیے جنگ کر سکتی ہیں۔ چیخیے چلائیے موہانی جان۔ اپنے حقوق کا مطالبہ کیجیے۔ ڈٹ جائیے۔ مجھے یقین ہے آپ کی جیت ہو گی۔"

کس کی جیت۔ میرا دل آمادہ نہ تھا۔ شعور [illegible] خواہش [illegible] نے اندر ہی اندر [illegible] معیار کھا تھا۔ مگر ضمیر [illegible] تھا۔ میں نے خود ان کے در [illegible] ان پر اربوں کھربوں کی [illegible] میں نے ہی پابندی [illegible] تھی۔ بار بار ان پر الزام تراشیاں کی تھیں انہیں شرمندہ کیا تھا وہ اب تک خاموش تھے۔ اب میں کس منہ سے ان سے حقوق کا مطالبہ کروں گی۔ کیا کہوں گی۔ خود ہی گھٹنا کھولے خود ہی لاجوں مرنے والا محاورہ تھا۔ اپنی خواہش اور ارادوں کی نفی کر کے خود ہی [illegible] منظور نہ تھا۔ لیکن اندر کے شور نے انا کی آواز کو مضمحل کر دیا [illegible] سنہرے مستقبل کی خواہش۔ چاہے جانے کی آرزو۔ کسی کی چاہت کی تمنا۔ زمین پر قدموں کی مضبوط گرفت کی کوشش۔

یہ سچ ہے کہ میں نے شادی کے دن ہی نہیں اس کے بعد بھی محمود [illegible] تھا۔ لیکن یہ بات بھی کہیں نہ کہیں [illegible] کہ اس طرح بہر ٹھہر نہیں [illegible] ملتا۔ اور اب کوئی نوجوان بھی مجھے [illegible] ملے گا۔ کوئی مجھے اتنے حقوق اور اتنے اختیار نہیں دے گا۔ جب میری دونوں چھوٹی بہنوں کی شادیاں ہو گئیں تب بھی میرے لیے کسی نے جھولی نہیں پھیلائی۔ کوئی مجھے لینے نہیں آیا۔ کسی نوجوان نے مجھے دیکھا بھی نہیں۔ چاہنا تو دور کی بات ہے۔ اب۔۔۔ اب تو ایسا خیال بھی محال ہے۔ اور اب یہاں کی فضا ماحول راس آ چکا ہے۔ میں نے اسے منظور کر لیا تو۔۔۔ اس سے دور ہونا بھی ممکن نہیں۔ منظور نہیں تو۔۔۔ باقی صرف ظاہری طمطراق ہی رہ جاتا ہے۔ جس کا بھرم کسی طرح قائم تھا۔ کرسی کا بول کسی بھی دن کھل سکتا تھا۔ ذہنی کیفیت بدل رہی تھی۔ اور ضد کی دیواریں شگاف پڑ چکے تھے۔ میں اُن کے رویے سے ملوک سے نیچے ہو رہی تھی۔ اور گھر کے حالات اور ماحول میں تحلیل ہو رہی تھی۔ ہر عام اور خوش نصیب عورت کی طرح۔ مگر میں خوش نصیب نہ تھی۔ میں خود میں ایک کھوکھلا پن محسوس کرنے لگی تھی۔ جیسے میری ضد، میری انا میرا وقار محض دکھاوا ہو۔ بناوٹی، جھوٹی خواہش۔ اندر سے میں ایک ستم رسیدہ عورت تھی۔ خواہشوں کی ماری، چاہت کی تمنائی۔

اس روز دوپہر کو کمرہ بند کر کے لیٹی تو ایک منٹ کو بھی نہیں سوئی۔ صرف روتی رہی بلاوجہ، بے سبب نہ صومی نے شور کیا تھا نہ بچوں نے ادھم بھرے کھیل کھیلے تھے نہ محسن نے کوئی کلمہ زبان سے نکالا تھا۔ مگر پھر بھی دل دکھ رہا تھا۔ پتا نہیں کیا ہو رہا تھا مجھے۔ اپنی مکمل نظر آ رہی تھی۔ ہمت پست ہو گئی تھی۔ شاید میرے نظریے بے جان تھے بے بنیاد تھے۔ میں عورت تھی۔ جس کی آرزو محض گھر کی حدود میں امن بنانا ہوتا ہے۔ جس کا سفر میکے سے سسرال اور جس کی منزل شوہر کا دل۔ محبوب مجھے پہلے بھی میسر نہ تھا۔ اور اب تو محبوب کی خواہش بھی نہ تھی۔ کہ بھروسے کا وقت گزر چکا تھا۔ اس گھر میں میری حیثیت مسلّم [illegible] مجھے یہاں سے کیا ملے گا۔ تحفظ کس قسم کا ہو گا۔؟ اماں جان اور بڑی آپا تو مجھے گھر کی ملکہ کا خطاب دے چکی تھیں۔ لیکن محسن۔۔۔ ان کی نظروں میں میرا کیا مقام ہے۔؟ صرف بچوں کی اماں کی خدمت گار۔۔۔ وہ جب چاہیں مجھے اس خدمت [illegible] ہے کہ آئندہ [illegible] ادھ مدت [illegible] بھی برداشت کریں۔ جونہی بچے بڑے ہوئے۔ اماں جان کی منزل پار گئیں۔ میرا کیا مقام ہو گا۔ کسی کو میری ضرورت نہیں ہو گی۔ میں ایک فالتو اور بے سود چیز ہو کر کسی کی نظروں میں وہ وقار حاصل نہ کر سکوں گی۔ بے حیثیت خدمت گار۔ [illegible] نے مجھے [illegible] نظر دوڑانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور یہ [illegible] میرا اندھیرا نظر آ رہا تھا۔

شام کو سیما اپنے شوہر کے ساتھ کہیں گئی ہوئی تھی۔ مجھے کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ بدن ٹوٹ رہا تھا۔ شاید بخار آنے والا تھا۔۔۔ سوچ سوچ کر سر میں دھمک ہو گئی تھی۔ میں اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ بے چینی نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ لیکن میرے پاس میرے ہی مسائل کا کوئی حل نہ تھا۔ آنکھیں بند کیے چپ چاپ لیٹی رہی۔ آنسو بلا ارادہ ہی بھر آئے۔ اور خود بخود بہہ بہہ کر تکیے میں جذب ہوتے رہے۔ کسی نے دکھ نہیں دیا تھا مگر درد دل نے بے قرار کر دیا۔ اپنی بے بسی اور تنہائی کی ہیبت ناکی نے خوفزدہ کر دیا۔ جی چاہا چیخیں ماروں۔ مگر کوشش اور ضبط سے سسکیوں کو روکا۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ پانی پینے کے لیے بھی اٹھا نہیں گیا۔ اس گھر میں کون تھا جو ہمدردی کرتا۔ میں نے کسی کے ساتھ کب ہمدردی کی تھی جو کوئی میری دردمندی کرتا۔ اکیلی تنہا میں تھی اور کمرے کی سرد تاریک فضا بے مہر دیواریں۔۔۔ اور بے جان چیزیں آنکھیں ڈوپٹے سے خشک کر کے لمبی آہ بھر کر کروٹ بدلی۔ کاش کوئی میرا بھی ہوتا۔ میری تنہائی کو دور کرتا۔ میرے آنسو پونچھتا۔ میری دلجوئی کرتا۔ مگر۔۔۔ ایسا کون ہوتا۔ میں نے بستر پر ہاتھ مارا۔ یہاں سے وہاں تک بستر ٹھنڈا اور کسی وجود سے خالی۔ میرے دل کی طرح۔ گود کی طرح۔ دل میں ابال سا اٹھا۔ گرم لہریں وجود میں ہلچل مچا رہی تھیں مجھے کسی نرم گرم وجود کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ ننھے منے بازوؤں کی حرارت۔ میرے چہرے اور گردن کو سنسنی پہنچانے لگی۔ تسکین کے احساس نے خوش کن ساتھ عطا کیا۔ بے اختیار میرا ہاتھ گردن اور چہرے کی طرف اٹھا۔ میں جانتی تھی یہ وہم ہے۔ میرا بستر کسی ننھے وجود سے خالی ہے۔ میری گود اس حرارت سے محروم ہے۔ اور بستر کی طرح میرا ہاتھ کسی گرم ننھے سے ہاتھ سے نہیں ٹکرائے گا۔ میں مایوس ہو کر شاید چیخ اٹھوں گی۔۔۔ میرے اندر کی سوئی ہوئی عورت بیدار ہو رہی تھی۔ ہاتھ گردن پر رکھ کر چہرے کو چھونے کی کوشش کر رہا تھا۔ تو حیرت اور سنسنی کا جھٹکا لگا۔

"نہیں میرا ہاتھ گردن سے نہیں۔ چہرے پر نہیں۔۔۔ دو ننھے ہاتھوں سے ٹکرایا تھا۔ گردن جھٹکے سے اٹھا کر میں نے سرہانے کی طرف دیکھا۔ میرے چہرے پر صومی کا ہاتھ تھا۔ گردن پر نعمان کا۔ حواس تابو میں کر کے میں انہیں تکنے لگی۔ نعمان دوسرے ہاتھ میں پانی کا گلاس لیے کھڑا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے گلاس آگے بڑھا دیا۔ پانی پی کر سینے کی جلن کو مٹایا حلق کی خشکی دور ہو گئی۔ لیکن جلن کچھ اور بڑھ گئی۔ محرومی کی جلن۔

"آپ کو بخار ہے امی۔؟" صومی نے اپنی معصوم آواز میں پوچھا تھا میں حیرت کے سناٹوں میں گم تھی۔

"دادی اماں نے کہا تھا آپ کو بخار ہے۔" نعمان نے نظریں جھکا کر کہا۔ "آپ کے سر میں درد ہو گا۔ اس لیے میں آ گیا تھا۔ آپ رو رہی تھیں میں۔۔۔ میں تو بخار دیکھ رہا تھا۔"

"تم سے کس نے کہا کہ۔۔۔ مجھے پیاس لگی ہے۔" میں نے بھیگی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"آپ رو رہی تھیں نا۔ ابا کہتے ہیں۔ جب امی روئیں تو ان کو پانی پلایا کرو۔ اس سے ٹھنڈک پڑتی ہے۔"

"ابا کو کیا معلوم۔"

"میں نے بتایا تھا کہ آپ روتی ہیں۔۔۔ آپ کو بہت درد ہوتا ہے امی۔ آج کمرہ کھلا ہوا تھا تو میں پانی لے آیا۔ میں بخار کی دوا لادوں

آپ دعا دیجئے گا نہیں۔ بھی بوا کے ساتھ جا کر ڈاکٹر سے لے آتا ہوں۔"

اچانک مجھے لگا کہ میں اب اکیلی نہیں۔ میں نے خواہ مخواہ سے ہمدردی کی بوند کی ہو۔ مگر قدرت نے میرے ہمدرد کو میرے سامنے فوراً کھڑا کیا تھا۔

"صومی تم یہیں ٹھہرنا۔ امی کا سر دبانا اچھا۔ اور شور نہ کرنا۔" نعمان نے صومی پر حکم چلایا۔ صومی اُچک کر بستر پر بیٹھ گئی۔ بولی "میں تو کہیں نہیں جاتی۔ یہیں رہوں گی۔ تم جاؤ بھیا۔ جلدی سے دوا لانا۔ بہوت جلدی۔ میں امی کا دل بہلاتی ہوں۔ کہانی سناؤں تو سے اور مینا کی۔۔۔؟"

میرے دل میں اٹھنے والی گرم اور تیز لہریں کیا مامتا کی تھیں۔؟ میرے اندر کی عورت بیدار ہو گئی۔ اور اس کی مامتا بھی۔ معلوم نہیں کیوں یک لخت یہ خیال ذہن میں آ گیا تھا۔ یہ ننھے ہاتھوں کی حرارت۔ معصوم لمس۔ یہ تنہائی کے خوف سے نجات کا احساس۔ مامتا کی بیداری ہے۔ میں نے صومی کو دیکھا۔ وہ میری خاموشی سے کچھ ڈر گئی تھی۔ آنکھیں کھوئے منتظر نظروں سے میری جانب تک رہی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے پیش قدمی نہیں کی۔ ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور ہم دونوں کمرے کے سناٹے میں تنہا تھے۔ اپنی اپنی جگہ تنہا۔ مامتا نے مجھے صبر و ضبط بھی چھین لیا۔ میں بے تابی سے اس کی جانب لپکی۔ شاید کمرے کی تاریکی تھی یا اس کے شعور میں چھپا خوف۔ وہ ابھی کسی سمجھوتے کے قابل نہ تھی۔ تیزی سے پلنگ سے اتر کر دروازے کی جانب بھاگی۔ میں اس کے پیچھے دوڑی۔ وہ دروازے سے ٹکرائی۔ گری۔ گر میں نے اسے اپنی پیاسی باہنوں میں بھر لیا۔ ترسی ہوئی آغوش میں بھینچ کر واپس پلنگ کی سمت بڑھی۔ صومی کا خوف ابھی باقی تھا۔ جب معمول اس نے ایک تیز چیخ ماری۔ اور حسب معمول باہر سے بوا نے شور کرنا شروع کر دیا۔

"ارے ارے دیکھو چھوٹی بی بی کہاں ہیں۔؟ گر گئی ہیں۔؟ دور ہی ہیں۔ یہ دونی بھیا کہاں گئے بہن کا دھیان نہیں رکھتے۔"

"ارے تو تم ہی دیکھ لو بوا۔ بڑی آپا کو بلائیں۔" کہیں دلہن نے پھر نہ اسے مارا ہو۔ چلو اٹھو۔ خون دون نہ بہہ رہا ہو۔"

میں اسے سینے سے چپکائے کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ اور میرا رواں رواں آسودگی کے حصار میں تھا۔ سرخوشی۔ سرشاری۔ سیرابی۔ کیا کیفیت تھی۔ ازل کی پیاس بجھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر میرے ہونٹ بے تابی سے بوسوں کی بارش کر رہے تھے۔ اور آنکھیں برس رہی تھیں۔ اور وہ ہنسی سے بے تاب ہو کر مچل رہی تھی۔ مجھے بھی ہنسی آ رہی تھی۔ یہ ایک نیا جذبہ تھا۔ انوکھی لذت اور دلکش احساس خوش کن حرارت میرے جسم میں دوڑتی پھر رہی تھی۔ روشنی کی لکیر نے اندر قدم رکھے۔ دروازے پر نعمان حیران کھڑا مجھے دیوانی حرکتیں کرتا دیکھ رہا تھا۔ اس کے عقب میں بوا کا چہرہ تھا۔ آنکھیں پھٹی ہوئی۔ منہ کھلا ہوا نعمان کے ہاتھ میں لفافہ تھا۔ شاید دوا کا وہ دوڑتا ہوا میری سمت آیا لفافہ پھینک کر میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ میں گھٹنے کے بل زمین پر گر گئی۔ دونوں بچوں کی خوشی کی چیخیں میرے کان پھاڑ رہی تھیں۔ لیکن میں بھی آج انہی کے انداز میں انہی کی ہم آواز ہو کر اسی رفتار سے چیخنا چاہ رہی تھی۔ خوشی کی زیادتی نے آوازوں کی رفتار میں اضافہ کر دیا تھا ہم بڑی آزادی سے جشن کجھائی منا رہے تھے۔

تبھی بوا نے اندر جھانکتے ہوئے ہمارے ہنگاموں کی آمد کی اطلاع دی ہمارے کمرے میں کھلبلی سی مچ گئی۔ میرے کپڑے اور [illegible] سامنے جانے کے قابل نہ تھا۔ میں باتھ روم میں [illegible] منہ دھونے لگی۔ نعمان نے اُچک اُچک کر [illegible] سے استری کیا۔ صومی [illegible] لے آئی۔ میں نے تیزی سے لباس [illegible] کیا۔ بال درست کیے اور ڈریسنگ روم میں داخل ہوئی تو چند اجنبی چہرے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"محسن میرا بہت عزیز دوست ہے۔ صاحب نے آگے بڑھ کر سلام کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"یہ شبو صاحب ہیں۔ بہت تیکھے نقش والی متبسم چہرے کی مالک لڑکی نے کہا۔

"یہ میری واٹف ہیں۔" شبو صاحب نے فاکسارانہ انداز میں کہا۔ "دراصل میں محسن سے ملنے اور ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنے چلا آیا اخبار [illegible] ہو رہے تھے۔ بار بار ہونٹوں پر [illegible] کر رہے تھے۔ دراصل تو [illegible] کر رہے تھے۔ اور گردن کو ادھر ادھر ہلا رہے تھے۔" یہ صرف اتنا ہی چاہتے ہیں کہ محسن بھائی ان کی خاندانی والی تجویز پر انحصار نہ کریں۔ بلکہ بیوی کی ضرورت کو اہم جانیں۔"

"میرا خیال ہے۔ موہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولے۔ آپ محسن تک میرا مافی الضمیر آسانی سے اور واضح طور پر پہنچا سکتی ہیں۔"

"کیونکہ ان کا خیال ہے کہ۔۔۔ بیوی کی مخالفت میں اور خاندان کی حمایت میں اس قدر پرجوش تھے کہ۔۔۔ محسن کو تقریباً اپنا ہمنوا بنا لیا تھا۔ اب میں آ گئی ہوں۔" مسکراتے چہرے والی بیگم نے شوخی سے

---

دیدہ دلیری۔۔۔ بھی محسن کی قدر نہ کی ان کی خدمت نہ کی۔ آ گئی حق لینے۔" بولو کیسا حق۔ میں نہیں مانتا۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ بچوں کے سامنے۔۔۔"

"مان جائیے ابا۔!" نعمان نے سنجیدگی سے کہا۔ "پہلے شبو صاحب بھی نہیں مانتے تھے۔ مگر اب وہ کہتے ہیں کہ بیوی کے جانے کے بعد وہ ادھورے رہ گئے تھے۔ ادھورے۔۔۔ یعنی آدھے۔"

"جی۔!" صومی مینا کی طرح چہکی۔ "آدھے۔۔۔ جیسے لکڑی کے دو ٹکڑے کر دو۔ وہ آدھی ہوتی ہے۔"

"اور اُن کی بیوی نے خود کہا کہ عورت کو اپنا حق خود لینا چاہیے" نعمان نے کہا۔

"تم دونوں چپ رہو۔ مجھے خود بھی کچھ بولنے دو۔" ان کی بیوی نے بچوں سے کہا۔ محسن کی حیرت بڑھ گئی۔

بچے اس عورت کی ترجمانی کر رہے تھے جو ان سے نفرت کرتی تھی مارتی تھی۔ اور جس کے قرب سے بچ کر وہ محسن کی پناہ میں آتے تھے۔ آج اسی عورت کی پناہ میں بیٹھے ہیں۔ یہ کیسا انقلاب ہے۔ انہیں یہ تبدیلی اچھی نہیں لگی۔ جب وہ چاہتے تھے۔ بچوں کو ماں کا پیار ملے۔ تب اس نے اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ اب محسن اپنے بچوں کی طرف خود متوجہ ہو گئے پوری شفقت دینے لگے تو وہ بچوں کے ساتھان کے کمرے میں آ کر بیٹھ گئی۔ پتا نہیں اس نے کس طرح نعمان اور صومی کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ یہ معمہ حل ہونا چاہیے۔

"مجھ سے تم کو بیزاری ہے۔ میرے بچوں سے نفرت۔ تم محض والدین کے فیصلوں کا بھرم رکھنے کے لیے میرے گھر رہتی ہو۔ میں نے تم سے کوئی واسطہ نہیں رکھا کہ کبھی اپنے لیے ظالم جابر کا خطاب نہ سننا پڑے۔ اب تم کیا چاہتی ہو۔؟"

محسن نے فیصلہ کن انداز میں سوال کیا تھا۔ توقع تھی۔ وہ حسب سابق بے باکی سے جواب دے گی۔ لیکن اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں ہونٹ کانپے۔ اس نے سسکی سی لی۔ اور درد بھرے ملتجی لہجے میں کہا۔

"میں معافی چاہتی ہوں۔"

کو دیکھ کر کہا۔ "اور اب۔۔۔ یہ بیوی کی اہمیت کو سمجھ گئے ہیں۔ دراصل خاندان کی موجودگی میں یہ ادھورا پن محسوس کرتے تھے۔ لیکن محسن بھائی پر اظہار نہیں کرتے تھے۔ حقیقت میں ان کا خیال ہے کہ اب۔۔۔ میرے واپس آنے کے بعد ان کی تکمیل ہوئی ہے۔"

"آپ۔۔۔ خود واپس آ گئی تھیں۔۔۔ یا۔۔۔؟" میں نے جھکے ہوئے سوال کیا۔

"خود ہی آنا پڑا۔۔۔ اپنے حقوق کا مطالبہ اور حفاظت عورت کو خود ہی کرنا ہوتی ہے۔ اسے مرد کی بھیک کی ضرورت نہیں۔ اور مطالبے میں شرم کی کوئی بات بھی نہیں۔ اپنا حق ہم خود ہی نہیں لیں گی۔۔۔ تو کوئی ہماری مدد کو نہیں آئے گا۔ بس یہ سوچ کر میں دندناتی ہوئی اپنے گھر پہنچی۔ اور پھر اپنے گھر کی حالت دیکھ کر بسورتی ہوئی اپنے بیڈ روم میں گئی۔ جہاں یہ ایک صوفے پر ٹکڑے پڑے تھے۔ کیونکہ بیڈ میلے کپڑوں سے اٹا پڑا تھا تو میں نے بڑی سختی سے کہا۔ سنیے شبو صاحب مجھے میرا حق چاہیے۔

---

اس رات جب محسن میرے کمرے میں آئے تو انہوں نے حیرانی سے دیکھا۔ ان کی بیگم ان کے بیڈ پر کمر اکڑائے سر اونچا کیے بیٹھی ہیں۔ ان کے دائیں بائیں نعمان اور صومی براجمان تھے۔ بیوی کو اپنے بیڈ روم میں اپنے بیڈ پر بیٹھا دیکھ کر محسن کا حلق تک کڑوا ہونے لگا۔ اس شادی سے ان کو نفرت کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہوا تھا سمجھتے تھے کہ ان کی شرافت، نیکی اور [illegible] سے وہ مغلوب ہو جائے گی۔ مگر اس نے کبھی ان کی کوئی بات نہیں مانی تھی جب ذرا سخت لہجے میں بات کرتے تو کچھ مرعوب ہو جاتی۔ اسے بچوں سے نفرت تھی۔ خود محسن سے بیزاری کا اظہار کرتی۔ کمزور شریف آدمی تھے گھر بھاتا تھی۔ امامت کی [illegible] کرتی تھی اور ان کی سختی کی وجہ سے بچوں کے کام بھی کرنے لگی تھی۔ مگر محبت۔۔۔ محبت یا مامتا کا خمیر نہ تھا اس کی فطرت میں۔ وہ اس سے بیزار رہنے لگے تھے اور بہت سنجیدگی سے کسی حل کی تلاش میں تھے۔ اسے اپنے کمرے میں اپنے بیڈ پر دیکھ کر ان کی بھنویں تن گئیں۔

"تم۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو۔؟ میں نے منع کیا تھا بھول گئیں؟"

وہ قدرے اور اونچی ہو گئی۔ اور صاف آواز میں بولی۔ "مجھے میرا حق چاہیے۔"

محسن بوکھلا گئے۔ یہ نیا مطالبہ تھا۔ اس نے ان سے کبھی کچھ مانگا نہ تھا۔ "کیسا حق۔۔۔؟" وہ گرجے۔ انہیں غصہ آ رہا تھا۔ افوہ۔۔۔